کہانی میری... زبانی میری

(غالب کی آپ بیتی)

مرتبہ

حفیظ عباسی

مجلس اشاعت ادب دہلی ۶

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

ناشر: مجلس اشاعت ادب (رجسٹرڈ)

اشاعت: - اپریل ۱۹۶۸ء

تعداد: - یک ہزار

طباعت: - اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی

قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

-: ملنے کا پتہ :-

دلّی بک سروس ۱۵۰۳/ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

مکتبہ شاہراہ۔ اُردو بازار جامع مسجد دہلی

اُستادِ محترم

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب

کے نام

جنہوں نے غالبؔ کو تمام دنیا سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے

فہرست عنوانات

دیباچہ ۳
۱۔ غالب شوریدہ حال ۹
۲۔ لڑکپن میں اسد ۱۱
۳۔ لم یلد ولم یولد ۱۲
۴۔ الفت ہائے خوباں ۱۳
۵۔ بساطِ صحبت احباب ۱۴
۶۔ ملازم ۱۵
۷۔ فقیروں کا بھیس ۱۶
۸۔ میرے دل کا معاملہ ۱۷
۹۔ یادِ رفتگاں ۱۷
۱۰۔ گرفتارِ بلا ۱۸
۱۱۔ ہم موحد ہیں ۱۹
۱۲۔ گدائے کوچہ ۲۱
۱۳۔ میرے خط ۲۲
۱۴۔ سربمہر گلاس ۲۳
۱۵۔ بادۂ گلفام ۲۴

۱۶۔ غذا ۲۶

۱۷۔ سیر و سیاحت ۲۶

۱۸۔ سفر کلکتہ ۲۶

۱۹۔ چکنی ڈلی ۲۷

۲۰۔ عبادت خانہ ناقوسیاں ۲۸

۲۱۔ لکھنؤ ۲۹

۲۲۔ سفر رام پور ۲۹

۲۳۔ رام پور سے واپسی ۳۱

۲۴۔ دوسرا سفر رام پور ۳۲

۲۵۔ جشن رام پور ۳۴

۲۶۔ عداوت اغیار ۳۵

۲۷۔ شکر دارم ۳۶

۲۸۔ خشک شہرت ۳۸

۲۹۔ ستمہائے روزگار ۳۹

۳۰۔ غالب وظیفہ خوار ۴۱

۳۱۔ گزارش احوال واقعی ۴۲

۳۲۔ فتنۂ شورِ قیامت ۴۳

۳۳۔ دہی رونا تن و دل و جان کا ۴۶

۳۴۔ نغمہ ہائے غم ۴۷

۳۵۔ پانچ باتیں ۴۸

۳۶۔ قلزم خوں ۰

۳۷۔ دلّی کی ویرانی ۴۹

۳۸۔ سکّے کا وار ۵۱

۳۹۔ حسرتِ تعمیر ۵۳

۴۰۔ اصلاحِ نظم ۶۰

۴۱۔ پن کال ۶۱

۴۲۔ موسم برشگال ۶۲

۴۳۔ عذاب النّار ۶۲

۴۴۔ ستارہ دم دار ۶۳

۴۵۔ واہ رے بندر اور پھر شہر کے اندر ۶۴

۴۶۔ وبا ۶۴

حصّہ دوم

۴۷۔ فارسی کا دیوان ۶۷

۴۸۔ پنج آہنگ ۶۷

۴۹۔ مہر نیمروز ۶۸

۵۰۔ دستنبو ۶۸

۵۱۔ قاطع برہان ۷۱

۵۲۔ درفش کاویانی ۷۲

۵۳۔ لطائف غیبی ۷۳

۵۴۔ سبد چین ۷۳

۵۵۔ نامہ غالب ۷۳

۵۶۔ اردو دیوان ۷۳

حصہ سوم

۵۷۔ انداز بیان ۷۷
۵۸۔ طرز بیدلؔ ۷۸
۵۹۔ الو ۷۸
۶۰۔ کلام معجز نظام ۷۹
۶۱۔ خدا کا مقہور ۷۹
۶۲۔ چراغ بے نور ۸۱
۶۳۔ شاعر سخن سنج ۸۴
۶۴۔ آفتاب لب بام ۸۵
۶۵۔ رندِ شاہد باز ۸۹

حصہ چہارم

۶۶۔ غزلیات ۹۳
۶۷۔ قصائد ۱۴۷
۶۸۔ مثنوی در صفت انبہ ۱۵۲
۶۹۔ قطعات ۱۵۴
۷۰۔ رباعیات ۱۵۹

دیباچہ

خطوط نگاری ایک فن ہے۔ زندگی "کرنا" بھی ایک فن ہے۔ زندگی اچھی اور بھرپور زندگی "کرنے" کے اصول نہیں ہوتے اچھے اور کامیاب خطوط لکھنے کے بھی اصول نہیں ہوتے۔ یہ اپنے آپ کو لکھوا لیتے ہیں اور بس ——— اردو نثر کی عمر بہت لمبی نہیں ہے، لیکن خطوط کے مجموعوں کی ایک وافر تعداد ملتی ہے۔ یہ مجموعے غالبؔ سے پہلے بھی ملتے ہیں اور ان کے بعد بھی۔ بلکہ بعد میں تو ان کی ایک طویل، رنگارنگ اور بوقلموں قطار نظر آتی ہے لیکن مکاتیب کے ایسے مجموعے جنھیں آپ اپنی فرصت کے اوقات میں اس لیے پڑھنا چاہیں کہ ذہنی مسرّت بھی حاصل ہو اور زندگی سے متعلق بصیرت بھی، بہت کم ہیں۔ اتنے کم کہ آپ اپنے ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتے ہیں: غالبؔ، شبلیؔ، مہدی افادی اور ابوالکلام آزاد، اور آگے بڑھیے تو پطرسؔ، منٹوؔ اور صفیہ اختر ——— رشید احمد صدیقی کے خطوط اس دور میں خاصے کی چیز ہوتے، لیکن نہ جانے کیوں انھوں نے اپنے احباب پر اخلاقی بندش عاید کر دی کہ ان کی اشاعت کسی حالت میں مستحسن نہ سمجھی جائے گی ——— (ابتدا میں غالبؔ نے بھی اپنے خطوط کی اشاعت کو ناقابلِ مستحسن ٹھہرایا تھا)۔ "آشفتہ بیانی میری" کے مصنّف کے خطوط کن اور کیسی ادبی اقدار کو لیے ہوتے۔ فی الحال اس پر قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے ——— بہر حال، خطوط نگاری کے ساتھ ساتھ اب خطوط شناسی بھی ایک مقبولِ عام اور بے حد دلچسپ فنّی مشغلہ بن گئی ہے۔ اس میں خاصی گہرائی اور پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے۔

لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ کم دلچسپ نہیں ہے کہ بلّی ماران، دلّی کے ایک نہایت ذہین، حسّاس اور ہوش مند شخص نے، جسے انتقال کیے اب سو سال ہوتے ہیں، اور جو غالبؔ تخلص کرتا تھا، جس کیفیت اور کمیت کے حامل خطوط لکھے اس کی دوسری مثال پیدا ہونا ابھی باقی ہے۔ غالبؔ کے خطوط ذہنی مسرت اور بصیرت کا کبھی خشک نہ ہونے والا سرچشمہ ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ غالبؔ نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو لیکن ایسا ضرور ہے کہ انھوں نے "جھوٹا" خط کبھی نہیں لکھا —— ان کے خطوط اوّل تا آخر، سچ مچ کے خطوط ہیں ان کا کاتب اکبر آباد کی ارسٹا کریسی کا ایک فرد، دلّی کا نجم الدولہ دبیر الملک، بڑا کھرا اور سچا انسان تھا اور بے حد وسیع القلب اور وسیع المشرب۔ اس کے احباب، دوستوں، عزیزوں، شاگردوں اور سرپرستوں کی کہکشاں اُس وقت کے ہندوستان کے طول و عرض میں بکھری پڑی تھی۔ وہ جس طرح شعر کہے بغیر نہ رہ سکتا تھا، اسی طرح خط لکھے بغیر رہنا بھی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ خط لکھنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس کے تخیّل کا عاشق صبح ہوتے ہی "کان پر رکھ کر قلم" نکلتا تھا، اور خط لکھتا تھا۔ "چاہے مطلب کچھ نہ ہو" —— کاتب کے علاوہ، مکتوب الیہم بھی سچ مچ کے، گوشت و پوست کے انسان تھے، جو غالبؔ کے خطوں کو آنکھ کا سرمہ سمجھتے تھے۔ خط پا کر خود پڑھتے تھے اور دوسروں کو پڑھاتے تھے۔ اس طرح یہ مسرت اور بصیرت بوئے گل کی طرح دور، دور پہنچ جاتی تھی۔ اسداللہ خاں صرف بڑے شاعر ہی نہ تھے، بڑے نثر نگار بھی تھے، اور بڑے دانش ور دوربیں اور دوررسا اندیش بھی۔ اردو میں خط لکھتے ہوئے ابھی زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ان کی چھٹی حس نے بتایا کہ انھوں نے ایسا طرزِ مکتوب نگاری ایجاد کیا ہے کہ "مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے" اور جو "ہجر میں وصال" کے مزے "دیتا ہے۔ —— اردو نثر کے میدان میں ایک شہ پارے کی آہٹ انھوں نے خود سن لی تھی —— احباب نے اصرار کیا کہ مجموعۂ مکاتیب جلد چھپنا چاہیے۔ غالبؔ کی مرزائی نے پہلے کوئی خاص

اغتنا نہ کیا، پھر کچھ دور اندیشی اور کچھ "خاطر احباب" کے باعث رضا مند ہو گئے۔ اور پھر جب مجموعہ چھپنے میں تاخیر ہوئی تو خود مشتاق و مضطرب ہو گئے ــــــ پہلے مجموعے نے ہی ان کی شہرت کو پر لگا دیے۔ غالب کے معاصرین نے چاہے فوراً ہی ان خطوط کی ادبی قدریں متعین نہ کی ہوں، لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر بھی نہ تھے کہ اردو نثر میں ایک انوکھی اور انمول کتاب کا اضافہ ہوا ہے ــــــ اور پھر دوسرے مجموعے نے غالب کی عظمت مسلّم کر دی۔

یہ کتنی حیرت اور مسرت کی بات ہے کہ ایک قلم کار کو یہ معلوم ہو کر میرے قلم کا معمولی سا ترشح بھی جلد یا بدیر اشاعت پذیر ہوگا اور اس کے باوجود وہ Self conscious نہ ہو، اس کی تحریر مصنوعی اور بوجھل نہ ہو۔ پہلے مجموعے کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد بھی غالب کے خطوط میں وہی بے تکلفی، سادگی، سچائی اور شگفتگی باقی رہی۔ یہ بہت بڑی اور قابلِ ستائش بات ہے۔

جین آسٹن نے کہا تھا کہ "تم پوچھتے ہو ناول میں کیا ہے۔ میں کہتی ہوں ناول میں کیا نہیں ہے"۔ یہی بات غالب کے خطوط کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ بظاہر یہ "میں" سے شروع ہوتے ہیں اور تم پر ختم ہو جاتے ہیں۔ "وہ" بیچ بیچ میں آتا ہے۔ لیکن غور کیجیے تو ہماری پوری معاشرتی زندگی "میں"، "تم" اور "وہ" کے اس مثلث میں چلی آتی ہے۔ غالب کے خطوط آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔ ہر اچھی اور کامیاب آپ بیتی، اپنے اندر جگ بیتی کو سمو لیتی ہے ــــــ انسان اپنے متعلق بولے بغیر رہ نہیں سکتا، لیکن اپنے متعلق بولنا اور لگاتار بولنا ہر تہذیب میں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا ــــــ البتہ "میں" جب "آفاقی میں" بنتا ہے تو جادو کا اثر کرتا ہے۔ غالب کے خطوط میں ایسا ہی "میں" ملتا ہے اور اس لیے یہ تاثیر سے خالی نہیں ــــــ

غالب کے خطوط ہشت پہلو آئینہ ہیں، جن میں ان کی شخصیت، معاشرتی و تہذیبی ماحول کا سارا جلال و جمال، خامیاں اور خوبیاں، پستیاں اور بلندیاں صاف اور واضح نظر آتی ہیں۔ یہ دل اور دلّی دونوں کا مرثیہ بھی ہیں اور زندگی کے حسن، خیر

اور سعادت کا طربیہ بھی   ان میں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی، معمولی اور غیر اہم باتیں غالب کی رچی ہوئی، زندہ اور توانا شخصیت کے لمس سے نہایت اہم اور غیر معمولی بن جاتی ہیں۔ ان کے پاس ایک لچک دار مگر قابلِ قبول مخصوص نظریہ ہے، جس سے وہ اپنی ذات، دنیا اور دنیا والوں کو دیکھتے ہیں، افراد اور اداروں، رسموں اور عقیدوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان کے ہر تبصرے سے اتفاق ہی کیا جائے لیکن ان کا ہر تبصرہ ہمدردی، خلوص اور انسان دوستی پر مبنی ضرور ہے۔ وہ تعصبات سے بالاتر نہیں ہیں لیکن ان کا تعصب، ایذا رسانی اور مردم آزاری سے پیدا نہیں ہوتا، بشریت سے پیدا ہوتا ہے۔

وہ جھوٹ بولتے ہیں لیکن جھوٹ بولنے کو کمزوری سمجھتے ہیں، آرٹ نہیں۔ یہی نہیں، اس کا اظہار اور اعتراف وہ خطوط میں اس طرح کرتے ہیں کہ خود پڑھنے والا اپنی پیشانی پر عرقِ انفعال کے قطرے محسوس کیے بغیر نہیں رہتا   ایک ایک فارسی قصیدے سے وہ کتنے کام لیتے ہیں، ایک انگریز حاکم کی شان میں کہا ہوا قصیدہ وہ کس طرح چند لفظ بدل کر دوسرے حاکم سے منسوب کر سکتے ہیں، امجد علی شاہ کے قصیدۂ مدحیہ کو وہ کس طرح واجد علی شاہ کا عقیدہ بنا سکتے ہیں۔ اس کا بے محابا اور بے جھجک اظہار بھی انھیں کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ عنفوانِ شباب کا لہو و لعب، قمار بازی کا چسکہ، "ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھنا" قرض کی مے، بے جا اسراف اور اس سے پیدا ہونے والی قرض کی ذلت اور انسانی زندگی کے ایسے ان گنت پہلوؤں کی نقاب کشائی صرف مکتوب نگار غالب کا قلم ہی کر سکتا ہے جن کی نقاب کشائی تو کجا، جن کے نزدیک تک جانا آج بھی ہمارے بیشتر مکتوب نگار "پاکیزگی" اور "ثقاہت" کے منافی سمجھتے ہیں   شرافت و شائستگی، دردمندی و انسان دوستی وہ قدریں ہیں، جو غالب کے خطوط میں نمایاں طور پر ابھرتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غالب جاگیرداری کے پرداختہ تھے ....

... اور ان کی قدریں جاگیرداری کی ساختہ ہیں   اور اس سے انکار ممکن نہیں،

لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کی بیشتر قدریں (اور شاید یہی ابدی قدریں ہیں) آج سرمایہ داری نظام میں بھی قابلِ احترام اور زندہ و تابندہ ہیں ——— اور یہ خصوصیت کسی بھی بڑے ادیب اور شاعر کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔

غالب ایک تہذیبی قوت ہیں۔ اس قوت کے عناصر مختلف ہو سکتے ہیں۔ ایک عنصر ان کا طنز و مزاح بھی ہے۔ اس عنصر نے بڑے نازک اور مشکل مقامات میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ سماج کا ہر وار انھوں نے اس پر روکا ہے۔ ان کا طنز زہر میں بجھا ہوا نہیں، اس لئے دل آزار نہیں۔ یہ پہلے قہقہے اور پھر غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے۔ ان کا مزاح اپنے اندر ذہانت اور صحت مندی رکھتا ہے، اس لیے خطوں کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ اپنی جان اور آن بڑی پیاری ہوتی ہے لیکن غالب کو اپنی بھی تھی اور دوسروں کی بھی۔ شاید اسی لیے وہ دوسروں کو طنز و مزاح کا نشانہ بنانے سے پہلے اپنے کو نشانہ بناتے ہیں اور یوں وہ اس کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ افراد، اداروں اور معاملات کو اپنے طنز و مزاح کی آماجگاہ بنائیں۔

خطوطِ غالب، غالب سے نصف ملاقات نہیں، مکمل ملاقات کا ذریعہ ہیں۔

ان خطوط کا مصنف ایک نارمل انسان ہے، فرشتہ نہیں، شاید یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ ایک البیلی اور چاہے جانے والی شخصیت کا مالک ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی نفسیاتی گرہ نہیں۔ نہ ہی وہ اپنے پڑھنے والوں سے کسی نفسیاتی گرہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے ملنے کے لیے کسی تکلف اور اہتمام کی ضرورت نہیں۔ اس کے ملاقاتی کمرے کے ایک دو نہیں دسیوں دروازے ہیں، ملنے والا کسی بھی دروازہ سے داخل ہو سکتا ہے ——— اور اردو کے اس بڑے شاعر، بڑے مکتوب نگار اور فطرتِ انسانی کے اس بڑے رمز شناس سے مل کر ذہنی مسرت اور بصیرت کی لازوال دولت حاصل کرتا ہے۔

راقم الحروف نے ان خطوں کو، جو سدا بہار ہیں، بار بار پڑھا اور ہر بار ایک خوشگوار تجربہ کیا۔ ہر بار کچھ نئے پہلو سامنے آئے۔ خطوطِ غالب کے بیشتر پہلوؤں پر

غالبیات کے ماہرین توجہ کر چکے ہیں، اس کے باوجود یہ خطوط نت نئے پہلو اور گوشے دکھاتے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ سب کا احاطہ کر لیا گیا۔ راقم الحروف نہ غالبیات کا ماہر ہے اور نہ ہی غالب شناس۔ بس اپنے تئیں غالب کا بے حد معمولی طالب علم سمجھتا ہے۔ خطوطِ غالب پڑھتے ہوئے، کبھی چند صفحات پر ناول کے نقوش نظر آئے، کبھی ڈرامے کے۔ لیکن جس چیز نے نسبتاً زیادہ متاثر کیا، وہ ان کا خود سوانحی انداز ہے۔

انھوں نے اپنے قلم سے، اپنے خطوں میں، اپنی پوری زندگی لکھ دی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دا نسل۔ میں نے کوشش کی ہے کہ یہ خود سوانحی تصویر، غیر متعلق بیانات کو حذف کر کے، زیادہ مربوط اور واضح ہو جائے۔ شاید اسے اصطلاحاً خود سوانح نہ کہا جا سکے اس لیے کہ غالب نے شعوری طور پر ایسی کوئی سوانح نہیں لکھی۔ لیکن غالب میں خود سوانح نگاری کی تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں اس کا ثبوت یہ کتاب ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے ——— اردو میں اعلیٰ درجے کی خود سوانح ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ عالمی ادب میں بھی خود سوانح کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ خود سوانح نگار، لکھتے وقت، یا تو اپنا بت تراشتا ہے یا بت شکنی کرتا ہے، اور اس طرح افراط و تفریط پیدا ہوتی ہے۔ اپنے متعلق معروضی نقطۂ نظر پیدا کرنا بڑا ایثار چاہتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ ایثار نظر آتا ہے، ہر جگہ نہ ہی، مجموعی طور پر سہی اگر آنے والے صفحات میں آپ کو خود سوانح کا لطف ملتا ہے تو یہی میرا صلہ ہے۔

آخر میں میں اپنے اساتذہ محترم شریف احمد صاحب اور محترم مغیث الدین فریدی صاحب لیکچرار شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی اور محترم غلام احمد علی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے یہ "آپ بیتی" پڑھی اور میری رہنمائی کی ———

میں ان سب حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی تصنیفات سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ انتخابِ کلامِ غالب کے لیے جناب امتیاز علی عرشی صاحب اور ڈسٹ کور کے آرٹ کے لیے جناب عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

حفیظ عباسی

کہانی میری، زبانی میری

غالب شوریدہ حال

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔

میں اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، غالب تخلص، قوم کا سلجوقی ہوں، سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ میرا ہم قوم سراسر قلمرو ہند میں نہیں، سمرقند میں دو چار یا دشتِ قبچاق میں سو دو سو ہوں گے مگر ہاں اقربائے نسبی ہیں:۔

غالب از خاک پاک تورانیم　　لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی　　بہ سترگاں قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک　　در تمامی زماہ دہ چندیم

میرا دادا قوقان بیگ خاں ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت سمرقند سے ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے، نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ پہاسو، جو اب سمرو بیگم کو سرکار سے ملا تھا، سیر حاصل، ذات کی

تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر دلّی کی ریاست چھوڑ اکبر آباد میں جا رہا، لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا، راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔

در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

نصر اللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا، اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۳ء جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا، میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا بریگیڈیر ہوا۔ اس نے اپنے زورِ بازو سے سونک اور سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے۔ جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات، علاوہ سال بھر مرزبانی کے کہ دس مہینہ بعد ہاتھی پر سے گر کر بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔

ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء یک شنبہ) میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

تاریخ ولادت من از عالم قدس

ہم "شورشِ شوق" آمد و ہم لفظ "غریب"

تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا، ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقّت ٹھہرایا ؎

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھو دیں جا کے معدن کو

لڑکپن میں اسد

پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ایّام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے تھا، معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر، اور مومن موحّد، اور صوفی صافی تھا، میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، غوامضِ فارسی آمیختہ بعربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہو گئی۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویٰ اجتہاد نہیں۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔

ناظر بنسی دھر کے والد عہد نجف خانی و ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو انھوں نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت و مختاری

کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انّیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمران کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبّت۔ آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی، چوں کہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑا کہ وہ گڈریوں والا کہلاتا تھا اور ایک کٹڑا کشمیری والا کہلاتا تھا اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی پیش دست رہتا تھا اور کٹڑوں کا کرایہ اوگاہ کر جمع کراتا تھا۔ (ایک بار) کنھیا نے کہا پتنگ بازی پر ایک مثنوی تو کہہ دو شعر گوئی کا شوق مکتب سے تھا۔ استاد کا رنگ پڑے بغیر نہ رہا۔ مثنوی

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی	لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنھیا نے کہا	اس قدر بگڑا، کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل! ہوائے دلبراں	بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے ریاں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار	یہ نہیں ہیں گے کسی کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کران کے نظر	کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ	لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے	قہر ہے دل ان میں الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے	بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں	مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب	غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

"رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

لم یلد و لم یولد

میں لم یلد و لم یولد ہوں، اکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینہ سے زیادہ نہ ہوئی۔ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دو بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں وہ میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا۔

الفت ہائے خوباں (عزیز و اقارب)

میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا، وہ تیس برس میں دیوانہ رہ کر مر گیا۔ میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال باندہ کا چچا تھا وہ میرا ہمشیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔

علی بخش مرحوم (میرا برادر نسبتی) مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ اس نے ۶۶ برس کی عمر پائی۔ نئی تحریر و تقریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ لارڈ لیک کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر سے جو محاربات ہوئے ان میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی، ان کو دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار برس کے ہوگے۔ یہ سن کر آپ نے کہا کہ "درست بجا ارشاد ہوتا ہے"۔

خدالیش بیامرزاد و بدیں دروغہائے بے نمک منگراد

بساطِ صحبتِ احباب

اللہ اللہ اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ میں نے ان کو دیکھا نہ انھوں نے مجھ کو دیکھا، نہ میرا کوئی حق ان پر ثابت نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر فقیر ہوں۔ جب تک جیوں گا دعا دوں گا، تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا

اور درویش کی صدا کیا ہے

نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ہیں۔ ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بمجرد استماع اس خبر کو ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔

حضرت جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے، کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دے دیا۔ نوکری موقوف، جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹننٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرائے پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے، کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس روپیہ مہینہ کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہٰذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیرا ہے۔ عشرۂ ثامنہ

کے اواخر میں ہیں۔ خدا سلامت رکھے غنیمت ہیں۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کا مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہولیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا، سچ، اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی ان ہی میں ہے جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

الگزنڈر ہیدالی مشتہر بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا اس جرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر یہ عالم اسباب ہے۔ اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

میں دنیاداری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں لیکن فقیر آزاد ہوں نہ مشیاد و کیّاد۔ ستّر برس کی عمر ہے بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرہ خواص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الولا دیکھے، ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ تعالیٰ۔ لیکن وہ مرحوم حسنِ صورت نہیں رکھتا اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ دوست خیر خواہ خلق حسن و جمال چشم بد دور کمال مہر و وفا صدق و صفا نور علیٰ نور، میں آدمی نہیں، آدم شناس ہوں۔

نگہم نقب ہمیزد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہل نظر را کہ رسیداں رفتم

ملازم

بی وفادار باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی۔ مگر خلیق اور ملنسار ہیں رستہ چلتوں

سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں کہ اطراف کی نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمائے چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں"۔ (تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

فقیروں کا بھیس

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے ؎

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

جب میں جیتا تھا میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ؎

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام ملّا۔ بساطی، نیچہ بند دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر بال رکھتے ہیں، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈوا دیا ؎

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

میرے دل کا معاملہ

شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشّاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سردفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی، ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے ؎

من بہ وفا مردم و رقیب بدر زد
نیمہ بشش انگبیں و نیمہ تبر زد

میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصوّر سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے، ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

وہی زمرّدیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور وہی ایک حور ؎

زن نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

یادِ رفتگاں

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال   دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں، میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا۔ چالیس بیالیس برس کا واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں ؎

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا ؎

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

گرفتارِ بلا

راز دانا غمِ رسوائی جاوید بلاست — بہر آزار غم از قید فرنگم نبود
جورِ اعدا راز دل بہ رہائی لیکن — طعنِ احباب کم از زخم خدنگم نبود

کوتوال دشمن اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں، باوجود مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم جاری کر دیا سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا، صدر میں اپیل کیا گیا کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں

میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صادر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحمدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا گیا یہاں تک کہ خود بخود اس نے میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ اگرچہ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جاتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں، روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ ہے، اور آستانۂ رحمت العالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو	ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے	کوئی ہمسایہ نہ ہو پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار	اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ہم موحّد ہیں

میں موحّد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہتا ہوں اور دل میں لَا موجود اِلَّا اللّٰہ لَا موثر فی الوجود اِلَّا اللّٰہ سمجھے ہوئے ہوں انبیا رسب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت کے سب مفترض الطاعۃ تھے محمد علیہ السلام پر نبوت ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ منقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی السلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام۔

بریں زیستم ہم بریں بگزرم

ہاں اتنی بات ضرور ہے اباحت اور زندقے کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں، نہ مجھے خوف نہ دعویٰ صبر ہے۔ میرا مذہب بخلافِ عقیدہ، قدریہ جبر ہے۔ صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں ہر مطلب کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو ۱۲

ساری عمر فسق و فجور میں گزری، نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ کوئی نیک کام کیا، زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں۔ اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایماو اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسّی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا پسند کریں) چھوڑ آئیں۔ اگر میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔

لاالٰہ الاّ اللہ، لاموجود الا اللہ، لاموثر فی الوجود الا اللہ

میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ معظم کے، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اور خاندان کا صوفی صافی ہوں اور حضرت صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں،

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا

ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے ؎

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رہی عزیزداری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مدارج و مراتب ہیں۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں، کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

گدائے کوچہ

میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں۔ مارچ ۱۸۵۲ء بلّی ماروں کے محلّے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں میرا رہنا تخفیف کرائے کے واسطے نہ تھا۔ صرف کالے صاحب کی محبّت سے رہتا تھا۔ حکیم محمد حسین خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کردو۔ دس بارہ برس سے اس تنگ نالے میں رہتا تھا، سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیا گیا اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کردو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مرمت لگا دی وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز عرض اور دس گز طول ہے۔ اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدّت، پاڑھ کا مرتب، گمان یہ گزرتا تھا کہ کٹ گھر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب بہم گر ایسی ملیں کہ ایک محل سرا اور ایک دیوان خانہ ہو نہ ملیں، ناچار یہ چاہا کہ بلّی ماروں میں ایک ایسا مکان ملے کہ جس میں جا رہوں، نواب علاؤالدین خاں علائی کی چھوٹی پھوپھی نے بے کس نوازی کی۔ کڑوا دالی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ۹ جولائی ۱۸۶۰ء

ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محل سرا قریب ہو، مگر خیر بہت دور بھی نہیں ہے

مسجد کے زیر سایہ ایک گھر بنا لیا ہے

یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالا خانے کا دالان جو میرے اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، مرنے جینے کا محل ہے۔ اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن کہیں چلمچی کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اُٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں، کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔

دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔

میرے خط

نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتہ ضروری نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں۔ مگر فارسی انگریزی خط جو میرے نام کو آتے ہیں تلف نہیں ہوتے بعض فارسی خط پر محلے کا نام نہیں ہوتا۔ انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی، ولایت سے مجھ کو آئے۔ جائے ان کی بلا، بلی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے۔ میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے، اس شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا امکان کہ تلف ہو جائے۔

سربہ مہر گلاس

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں۔ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ، لذیذ، خوشبو، افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں سے اکثر بسبیل ارمغاں بھیجتے رہے۔

شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں، اب وہ دل کہاں سے لاؤں۔ طاقت کہاں سے پاؤں۔ آموں کی طرف رغبت، نہ معدے میں اتنی گنجائش۔ نہار منھ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا، رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین العشائین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم عصری آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں۔ مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو سات پانچ۔ بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے۔

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز　　کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا　　شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے "کیا لکھیے؟"　　نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے　　خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مرد میداں ہے؟　　ثمر و شاخ، گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں　　آئے، یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک　　پھوڑتا ہے جلے پھپولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے! — آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ، نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں؟ — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں!

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہ کن، باوجود غمگینی ق

جان دینے میں اس کو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں! مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام — شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ راحت سے — باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے، بہ حکمِ رب النّاس — بھر کے بھیجے ہیں، سر بہ مہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل — ہم کہاں ورنہ، اور کہاں یہ نخل

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا، اگر اک بار — پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا — نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد کا توشہ — طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم — ناز پروردۂ بہار ہے، آم

خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو — نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

بادۂ گلفام

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس ٹیل اور ایک اولڈ ٹام، یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے حد چوبیس روپے درجن آتی تھی اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی۔ یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔ بیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔

بیس برس آگے کی یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں یا بیش از طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمولی میں مجرانہ لیتا تھا ؎

پیوں شراب، اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں۔ بڑے بڑے مینہ برسے، پینا ایک طرف دل میں خیال بھی نہ گزرا ؎

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قید کیش و ملت سے آزاد ہوں اسی طرح بدنامی و رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں۔

میری مدت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرنچ کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا، وہ اگر نہ ملتی تھی تو مجھ کو نیند نہ آتی تھی۔ اگر جوانمرد، خدا دوست، خدا شناس، دریا دل، مہیش داس ہندوستانی شراب جو رنگ میں فرنچ سے مشابہ اور بو میں اس سے بہتر تھی مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جانبر نہ ہوتا ؎

از دیر دلم دایہ زہر دری جست — از بادۂ ناب یک دو ساغری جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بہ من — آبے کہ برائے خود سکندری جست

غذا

غذا مجھ کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی۔ قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب، چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز اسی قدر عرق شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا۔

بہتر برس کا آدمی پھر رنجور دائمی۔ غذا یک قلم مفقود، آٹھ پہر میں ایک بار آبِ گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی نہ بوٹی، نہ پلاؤ نہ خشکا، صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر دوپہر گوشت کا پانی، سرِ شام گوشت کے تلے ہوئے چار کباب سوتے ہوئے پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب ...... اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ خرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں۔ میرتقی کا یہ شعر میرے حسب حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصّہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

سیر و سیاحت

میں سیر و سیاحت کو بہت عزیز رکھتا ہوں ؎

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

سفر کلکتہ

۱۸۰۳ء میں کلکتہ گیا ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں ۔۔۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب　　وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر　　طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ　　وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

چچا کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے۔ مگر سات ہزار روپیہ سال اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا ——

۱۸۰۳ء میں کلکتہ گیا۔ گولبرگ صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر ریزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے، نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی، دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔

اللہ اللہ کلکتہ میں جو شور تشور اٹھا تھا۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔ میرا شعر ؂

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہم چو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

چکنی ڈلی

"فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن" کی بحر میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے، انھوں نے ایک مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی

کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لے لی .....

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں، کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بہ گریباں، کہ اسے کیا کہیے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
مسّی آلودہ سرانگشتِ حسیناں لکھیے — داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے — سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے، نسبت دیجے — خالِ مشکینِ رخِ دل کشِ لیلا کہیے
حجرالاسود دیوارِ حرم کیجیے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرایئے گر مُہرِ نماز — میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟ — کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجئے؟ — کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے؟ — کیوں اسے نقش پئے ناقۂ سلما کہیے

آخیر کی بیت ہے:

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

عبادت خانہ ناقوسیاں

بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا تھا۔ اگر اس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں

رہ جاتا اور اِدھر کو نہ آتا ہے

عبادت خانۂ ناقوسیاں است
ہمانا کعبۂ ہندوستاں است

ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغِ دیر" اس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

لکھنؤ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشہ سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

سفرِ رامپور

ایک قرن بارہ برس سے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں والئ رامپور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اس روپیہ کی رسید نہ لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے۔ میں خط کا جواب لکھ بھیجتا، اس ماہانہ کے علاوہ کبھی دو سو، کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعے کی آمد مفقود، انگریزی پنشن مسدود، یہ بزرگوار وجہ مقرر کی ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا۔ تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔

نواب یوسف علی خاں بہادر اکتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ

برس کے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے، اب میں گیا۔ دو مہینہ رہ کر چلا آیا۔ وہ سو روپیہ مہینہ یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرّر ہے۔

میں نے دلی کو چھوڑا، رامپور کو چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ رجنوری ۱۸۶۰ء کو مراد نگر اور جمعہ ۲۰ رجنوری کو میرٹھ پہنچا۔ شنبہ ۲۱ ر کو بھائی مصطفےٰ خاں شیفتہ کے کہنے سے مقام کیا۔ شاہ جہاں پور، گڑھ مکتیشر، مرادآباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ چار دن والیٔ شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ بحسبِ اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس، ڈاک منشی آشنا ہو گیا۔ برابر دلّی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام، محلے کی اور عرف کی حاجت نہیں۔

نواب صاحب مانع رہے اور بہت دریغ کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر میں ایسے انداز سے چلا کہ رمضان کی چاند رات کے دن یہاں پہنچا۔ یک شنبہ کو غرّہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ وا کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔

قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا، یعنی رامپور رہوں

تو دو سو روپیہ ماہانہ پاؤں اور دلّی رہوں تو سو روپیہ۔ سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی، بس۔ بہر حال غنیمت ہے۔ رزق اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے، کمی کا شکوہ کیا۔

تعظیم و توقیر بہت۔ ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر دوا کو بھی میسّر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اسی پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے۔ اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے غذا میرے بھی خلافِ طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس طرح ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ ایسا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک گوارا، سریع النفوذ۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔

رامپور سے واپسی

میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ کو یہاں آگیا تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک شخص کا قول ہے کہ یہ شخص والئ رامپور کا کا استاد تھا۔ اور وہاں گیا تھا، اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا دو سو روپیہ کر دیا تھا۔ لفٹیننٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے برطرف کر دیا۔

رئیس کی طرف سے بطریق وکیل کمشنری میں متعین نہیں ہوں جس طرح امرا، واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعا ئے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلّی رہوں چاہوں اکبرآباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں۔ کپڑوں کے صندوق میں آدمی درجن شراب دھروں۔ آٹھ کہار جھٹکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو بیاہل چھوڑ دوں۔ دو ساتھ لوں۔ چل دوں رامپور سے جو لفافہ آیا کرے گا۔ لڑکوں کا حافظ لوہار و بھیجا کرے گا گاڑی ہوسکتی ہے۔ شراب مل سکتی ہے کہار بہم پہنچ سکتے ہیں طاقت کہاں سے لاؤں۔۔۔

رئیس رامپور سو روپیہ دیتے ہیں۔ سال گذشتہ (۱۸۶۳ء) ان کو کچھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے حواس نہیں پاتا متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں ؎

شعر کی فکر اسد! چاہیے ہے دل و دماغ
عذر کہ فسردہ دل ہے دل و دماغ ہے

جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجیے تو میں سکہ لبریں ورنہ خیرات خوار ہی اور گر یہ عطیہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہ میری قسمت ہے۔ برس دن سے کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر ۱۸۶۴ء تک آئی۔ اب آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب ازراہ جواں مردی دیئے جاتے ہیں۔

دوسرا سفر رامپور

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

رامپور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار اور روزینہ خوار ہوں۔ رئیس حال نے مسند نشینی کی

جشن کیا، دعاگوئے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا۔ ۲/ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو ہفتہ کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ بلکھوئے رہوں، وہاں قافلہ کی گنجائش نہ پائی، ہاپوڑ کو روانہ ہوا، دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے پہل چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے قافلہ آیا، میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی شراب پی کباب کھائے ؎

پیوں شراب، اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ چار پانچ بجے کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بالوگڈھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ بعد قطع منازل سنہ ۱۲/ اکتوبر کو وہاں پہنچا۔ موسم اچھا تھا، گرمی گزر گئی تھی، جاڑا ابھی چمکا نہ تھا۔ عالم اعتدال آب و ہوا۔ سایہ و سرچشمہ جابجا، آرام سے رامپور پہنچا ———۔

میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن پلاؤ، متنجن، لپسندے، دونوں وقت روٹیاں، خمیری چپاتیاں، مربّے، اچار، میں خوش، لڑکے بھی خوش، سقّا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ تعظیم، تواضع، اخلاق کسی باب میں کمی نہیں۔ نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی لیکن اس میں میرا فائدہ ہے نقصان نہیں۔

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت منعم کی ہمت۔ نواب صاحب

از روئے صورت، روحِ مجسّم اور باعتبارِ اخلاق آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلّے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا، اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ، بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی مصطفیٰ خاں صاحب بتقریب تہنیت مسند نشینی و شمولِ جشن آنے والے ہیں۔ اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع۔ ۵ دسمبر سے خلعت کا آنا مسموع۔

رہی مصاحبت۔ اس کو پہلے تسلّی پھر علومِ رسمیہ سے آگہی۔ پھر زبان آوری، پھر قسمت کی یاوری شرط ہے۔ باقر علی خاں کو تین شرطیں درکار۔ پہلی شرط موجود۔ بعد جشن رخصت ان دونوں لڑکوں کے باب میں کلام کروں گا۔

جشنِ رامپور

جشن کی وہ شان کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر دو کوس کے فاصلے پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے خیام برپا تھے۔ صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند مصاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ سہ شنبہ ۱۵ دسمبر ۱۸۶۶ء کو حضور پر نور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ روشنی، آتش بازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے ؎

رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر　　　　که جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم

رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمع اشرافِ نژادِ آدم

رام پور، ایک بڑا باغ ہے از روے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خورم

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں، دجلہ فشاں دستِ کرم

ابرِ دستِ کرمِ کلب علی خاں سے مدام
دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبح دم باغ میں آجائے جسے ہو یہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم

حبذا باغ ہمایوں تقدس آثار
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالونِ حرم

سالکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس
خضر بھی یہاں اگر آجائے تو لے ان کے قدم

لو صاحب، کھچڑی کھائی، دن بہلائے، کپڑے پھاڑے، گھر کو آئے۔ ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء دو شنبہ کو دن غضب الہی کی طرح اپنے گھر پہ نازل ہوا۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے بیمار داری اور غم خواری بہت کی ؎

جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

عداوت اغیار

ایک قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا، متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا کہ خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری۔ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور

اور فرمایا کہ اس میں جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ اس نے ہنوز تم کو کچھ نہیں بھیجا۔ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا ہے کہ مجھ کو پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم جیسے خط لکھو اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر میں یہ نہیں جانتا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر، ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مرگیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے ؎

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی

دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی آسامی

شکر دارم

امجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز میں ایک صاحب میرے نیم آشنا، یعنی خدا جانے کہاں کے رہنے والے کسی زمانے میں وارد اکبر آباد ہوئے تھے۔ کبھی کہیں کے تحصیل دار بھی ہو گئے تھے۔ زبان آور اور چالاک۔ اکبر آباد میں نوکری کی جستجو کی۔ کہیں کچھ نہ ہوا، میرے ہاں ایک دو بار آئے تھے۔ پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلی میں آرہا۔ کم و بیش بیس[20] برس ہوئے ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا خط ناگاہ مجھ کو بسبیل ڈاک آیا۔ چوں کہ ان دنوں میں دماغ درست اور حافظہ برقرار تھا، میں نے جانا کہ یہ وہی بزرگوار ہیں۔ خط میں پہلے مجھ کو یہ مصرعہ لکھا ؏

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

آپ سے جدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا۔ وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ میں آیا ہوں اور وزیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے

ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انھیں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ نے خان اور بہادر کا خطاب دیا ہے مصاحبوں میں نام لکھا ہے۔ مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط جو مناسب جانیں وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط فرمان طلب آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصہ میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی بیت اسم یہ ہے ؎

امجد علی شہ آں کہ بہ ذوق دعائے او
صدرہ نماز صبح قضا کرد روزگار

متردد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ بھیج دیا۔ رسید آگئی صرف۔ پھر دو ہفتہ بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچا، وزیر پڑھ کر بہت خوش، بہ آئین شائستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مہر کن سے مہر خطابی کھدوا کر بھیج دیجئے۔ چاندی کا نگینہ ہو۔ مربع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدے کے بادشاہ تک گذرنے کی نوید۔ بس پھر دو مہینہ تک ادھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو خط بھیجا الٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہنچنا اور حاضر رہنا سچ۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط۔ بہادری کی مہر تم سے بہ فریب حاصل کر کے مرشد آباد چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیئے تھے ؎

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

چودہ پارچہ کا خلعت ایک بار، اور ملبوس خاص، شال، رومال، دوشالہ ایک بار...
حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانچ سو روپیہ۔

سال مقرر ہوئے۔ مدح کی فکر نہ کر سکا۔ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گذرا نہ تھا، میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بیٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک، قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہوا ـــــ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔

خشک شہرت

صنعت سہل ممتنع میں میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا، کچھ قدردانی نہ فرمائی ردّ فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی وہ محی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوس انا ولاغیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر برس کی میری عمر ہوئی۔ سوائے خشک شہرت کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

احسنت و مرحبا کا شور سامعہ فرسا ہوا خیر و ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا سمجھے محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے۔

ایسے طالع مربّی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے

اے خداوند بندہ پرور! یہ سب باتیں وقوعی واقعی ہیں۔ اگر ان سے قطع نظر کرکے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کرسکتا ہوں، تمام کون کرے گا۔ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیونکر لکھی تھی اور یہ شعر کیونکر کہے تھے۔ عبدالقادر کا یہ مصرعہ گویا میری زبان سے ہے۔ ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

ستمہائے روزگار

میں انگریزی ریاست میں علاقہ ریاست دودمانی کا رکھتا ہوں، معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار کے دسواں نمبر اور پارچہ اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوزی یہاں آئے نہیں اب زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ میرے مربّی قدرداں، جناب ایڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے۔ لفٹینٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔

صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ متھرا داس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو جا مارا، ادھر خوب چند چین کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر اک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو، نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل بھیّا کے سر، بااینہمہ کبھی خاں نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرے سے کچھ بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے۔ ایک میرے مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا شاگرد پیشہ جدا، بچے جدا، آمدنی وہی ایک سو باسٹھ روپے تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہوگیا۔ روزمرہ

کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپے مہینا بچا، روزمرّہ کا خرچ چلا، یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ بارے مہینا پورا گزرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرضِ متفرق ادا ہو گیا، متفرق رہا۔ خیر رہو، صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہو گئی

اے شہنشاہ آسمانِ اورنگ | اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں | تھا میں ایک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی | ہوئی میری وہ گرمیِ گفتار
کہ ہوا مجھ سا ذرّہ ناچیز | روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری | ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی | جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں، کہ ہوں | بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مدّاح | تھا ہمیشہ سے، یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا، صد شکر | نسبتیں ہو گئیں مشخّص، چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟ | مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد، اگرچہ مجھ کو نہیں | ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر | تا نہ دے، بادِ زمہریر، آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟ | جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال | کچھ بنایا نہیں ہے، اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ | بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان! | دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار!

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی — وقنا ربّنا عذاب النّار
میری تنخواہ جو مقرّر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے، مردے کی چھماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات — اور چھماہی ہو سال میں دوبار
بسکہ لیتا ہوں، ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہوگیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیے — ہے، زبان میری، تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجئے — ہے، قلم میری، ابرِ گوہر بار
ظلم ہے، اگر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا! — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو، زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالبؔ وظیفہ خوار

دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرّر کیا۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔

جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے ؎

غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے، بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں۔ مگر فائدہ وہی قلیل۔

گزارشِ احوالِ واقعی

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی   اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری   کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل   ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف، کہ ظفر کا غلام ہوں   مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال   یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما، ہے شہنشاہ کا ضمیر   سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون، اور ریختہ! ہاں اس سے مدعا   جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا، زرہ امتثالِ امر   دیکھا، کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات   مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ   سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی، پہ طبیعت بری نہیں   ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب! خدا گواہ   کہتا ہوں سچ، کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ا غالب نے مرزا جواں بخت کا سہرا لکھا مقطع تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں   دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

شاہ ظفر کو گمان گذرا کہ غالب نے ان کے استاد ذوق پر چوٹ کی ہے۔ شاہ کے ایما پر ذوق نے بھی اسی زمین میں زور و شور کا سہرا کہا اور مقطع میں تعریض کا جواب تعریض میں دیا ؎

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو   دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

چنانچہ مذکورہ بالا قطعہ اسی سلسلہ میں بطور معذرت کہا گیا ہے۔

فتنۂ شورِ قیامت

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی۔

..... وہ ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہر و محبت درپیش آئے، شعر کہے دیوان جمع کیے، ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ معاملات رہے، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا —— اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے کی ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگرچہ کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں۔ اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بر وقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اور اہل حرفہ کوئی بھی نہیں مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامہ میں شریک رہے ہیں۔

میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہ مزدوری جانو۔ اس فتنہ آشوب میں کسی مصلحت میں

میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا احکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف سے بادشاہی دفتر میں سے، یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر، ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔

میرٹھ سے آکر دیکھا یہاں بڑی شدّت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں مت رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ ہے کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے، نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برون صاحب کی زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکمِ وقت کو اختیار ہے۔ یہ عبارت جمعدار نے محلّے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی۔ یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں،

انھیں ڈھادو اور آیندہ کی ممانعت کا حکم سنادو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھئے شہر بسنے کی کون سی مہورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں۔ یا باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الحکم للہ و الملک للہ۔

بسکہ فعّال ما یُرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہُ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟ — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بروے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا، کسی کو درخواست نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔

وہی رونا تن و دل و جاں کا

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہوجاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اسی ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کیا غم ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت۔ غمِ مرگ میں قلعۂ نومبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں، مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا انیس بیس برس کا بچہ۔ مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو عزیزوں کے برابر نہیں جانتا؟ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں!

غمِ فراق حسین مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا جہاں ہوتے خوش ہوتے، گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں، عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ ع

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہر آرزو

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا، اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیاء اور امراء کے ازواج اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں، ایک بیوی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز یہ باہر۔ مداری کی جورو، بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے

مہینہ بھر سے پھر آ گئے کہ مجھو کام رتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسہ کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ بقدر سد رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے آدمی ہوں دیو نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمّل کیوں کر کروں ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انساں ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

نغمہ ہائے غم

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں، سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے وہ یوسف علی خاں آئے، مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں، اللہ، اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا ؎

ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع — چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا ہے کہ جیسے جھاڑو پھیر دی، کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینے کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقبرہ اُجڑ گیا ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے تمام لوگ اس موضع میں آباد ہو گئے تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں، وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ میں معہ زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور

کیا نفس مطمئنہ بخشا۔

پانچ باتیں

دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمروِ ہند میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ ر دسمبر ۱۸۵۹ء کو یہاں داخل ہوں گے، دیکھئے کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیر تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، لوہارو، چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو۔ تحت حکومت ہانسی و حصار پالوڈی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلّی ماروں میں یہ سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود و محروم و مغموم ؎

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی جلا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

قلزم خوں

اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں

مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری پانی ہی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کا ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ سب اٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔

دلّی کی ویرانی

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلّی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں، پنشن داروں سے حاکم کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی۔ مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھیے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے۔ یہ بات اڑا دی۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کئے

جائیں گے۔ اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔

جو کچھ ہوتا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، ابر آیا، مینہ برسا، یعنی سعی کو، تدبیر کو، خواہش کو دخل نہیں آبادی کا آوازہ پھر رہا ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں۔ کئی ہزار گھر کی بستی ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہوگا۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتا ہے

اللہ اللہ دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد۔ ارے بندہ خدا، اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دلّی واللہ اب شہر نہیں، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔

جامع مسجد کے باب میں کچھ رپیش لاہور سے آئی تھیں۔ یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں یقین ہے کہ واگذری کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

یہاں دو سڑکیں دوڑتی ہیں، ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا۔ اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے۔ ایک میدان نکالا جائے گا۔ جنوب کی دکانیں بہلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اموجان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی کے اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے۔ کیوں میں دلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں۔ جب اہل شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولہے میں ڈالوں۔

نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خموش

دوسرا غالب وہ خود مدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی۔ کس برتے پر تتّا پانی، ہائے رے دلّی، وائے رے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی۔

سکّے کا وار

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

بھاگا نہیں پکڑا نہیں گیا، دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا، کسی طرح کی بے خیالی اور نمک حرامی کا دھبّا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا اس میں ایک جز اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا ہے

بہ زر زد سکّہ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا "غلط لکھتا ہے، بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر بادشاہ کے نوکر شاعر، خدا جانے کس نے لکھا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزارنا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔" اس وقت تو چرچا ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکار لکھی کہ یہ جو اسد اللہ خاں نامی فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے۔ اس سے کام نہیں نکلتا، یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اُس کا سکہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ غرض اس مقصود سے یہ ہے کہ یہاں موجود ہوں اور عملے سے راہ و رسم ہے۔ یہ تو کوئی بتاتا نہیں کہ تاریخ روبکاری کیا ہے اور صدر کو بھیجی گئی یا نہیں۔ اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کمشنر جدید

سے ملوں گا۔ اسی سے اگر دے گا تو نقل لوں گا۔ جواب ازراہ احتیاط اسی کمشنر کے عہد میں بھی بھیج چکا ہوں۔ میں تو علی علی کر رہا ہوں، جیوں تو اور مروں تو کہیں جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے نکل جاؤں۔ یہ دن روپے روز بھی اس غاصب ملعون کی گور میں جائیں جس نے مجھے دس ہزار روپیہ سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنۃ والعذاب

گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

یہاں میر احمد حسن والد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت جب بہادر شاد تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا۔ ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی وہاں اس سکّہ کے گزرنا ذوقؔ کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء میں ہوا ہے۔ میں نے اکبر آباد، فرخ آباد، مارہرہ، میرٹھ اپنے احباب کو لکھا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۷ء تینوں مہینوں کے بارہ پرچے دیکھے جائیں۔

سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں۔ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو ذوقؔ نے یہ دو سکّے کہہ کر گزارنے، بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوقؔ کے معتقدین میں تھے، انھوں نے دلّی اردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب تک وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اس میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکّے سُنے ہیں۔ اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گذارنے ہوئے ثابت ہوئے ہیں ؎

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

میں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلی اردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈھا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبّا مجھ پر رہا پینشن بھی گئی اور ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہو رہا موافق رضائے الٰہی ہوا، اس کا گلہ کیا ہے

چوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داور است
بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

میں نے سکّہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا، یہ گناہ نہیں اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے، اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

حسرتِ تعمیر

عرضی میری سرجمز [؟] لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزری، اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی معہ کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیجدی جائے۔ اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق قاعدے کے خط لکھتا یہ نہ ہوا ——— وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی صاحب کمشنر نے کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ کلکٹر صاحب کے یہاں آیا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں نہیں پایا گیا۔ اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

گورنراعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے، ان کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا یا چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہیں پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہوسکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیامِ گورنری ہوئی۔ میں اپنی عادتِ قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو، اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہیں کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار خلعت موقوف پنشن مسدود، وجہ نہ معلوم لاموجود الا اللہ، لامؤثر فی الوجود الا اللہ۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے، ناامید ہوکر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹیننٹ گورنر پنجاب آئے میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے، انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا، بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ

جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا۔ تم بھی انبالے جاؤ۔ شریک ہوکر خلعت معمولی لے آؤ ـــــ کیا کہوں دل پر کیا گزری۔ مردہ جی اٹھا۔ ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سناٹا گذرا کہ سامانِ سفر انبالہ اور مصارفِ بے انتہا کہاں سے لاؤں اور طرہ یہ ہے کہ نذر معمولی۔ میرا کیا قصیدہ ہے۔ اِدھر قصیدہ کی فکر، اُدھر روپیہ کی تدبیر، حواس ٹھکانے نہیں شعر کا کام دل و دماغ کا ہے وہ روپے کی فکر میں پریشان ؎

شعر کی فکر کو چاہیے ہے دل و دماغ
عذر، کہ یہ فسردہ دل، بے دل و دماغ

میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کردے گا مگران دلوں نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند ہے لفٹیننٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم ایک غار ہو گیا ہے۔

کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام سے ترک ملاقات ہے۔ مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں تو مختار کار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈاکٹر ود رصاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ ری ٹیگس صاحب مقرر ہوئے۔ ان سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ شعرا ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے مدد چاہی ـــــ میں نے سات کتابیں بھائی ضیا الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے۔ ان کا حال لکھ بھیج۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے بقید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس کے سواد کی صورت یہ ہے۔

"نواب ضیا الدین خاں بہادر، رئیس لوہارو سے فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے ہیں، فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں، اسد اللہ خاں کے شاگرد ہیں" ـــــ

نواب مصطفیٰ خاں بہادر، علاقہ دار جہانگیر آباد، اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔" ——— منشی ہرگوپال محرر قانون گو سکندر آباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں، تفتہ تخلص کرتے ہیں اور اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد۔"

اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف شاعر کا نام اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن، وطن کا نام معہ تخلص درج ہوگا۔

میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پرچے اور رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہوگیا لیکن دربار و خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہل دفتر نے بموجب حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمہارا دربار اور خلعت واگذاشت ہوگیا مگر دلّی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا۔ اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے، دربار کیا۔ میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عنایت کیا ؎

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا

میں غریب اور تو غریب نواز

...... پنشن کا مقدمہ درپیش ہے کبھی صاحب کمشنر بہادر کے پاس، کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے۔ خود نہ جاؤں تو خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں یا کسی وقت کوئی پرسش آجائے۔ بائیس مہینہ سے وہ رزق جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا مسدود ہے۔ کیا کھلاؤں اور کیوں کر جیوں ؎

جناب قبلۂ حاجات اس بلاکش نے　　　بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

الحمد للہ کہ گنہ گار نہیں ٹھہرا۔ پنشن پاؤں گا مگر وہ پنشن گورنمنٹ کے پولٹیکل سررشتے سے مقرر ہوئی ہے۔ سو دہلی کا ایجنسی دفتر فرد فرد لٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطے میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر یہاں صدر ٹھہرا۔ اسی دفتر میں میری ریاست کا، میری معاش کا، میری عزت کا نام و نشان نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں۔ کچھ نکل گئے ہیں، کچھ باقی رہے ہیں یہ بھی نکل جائیں گے ؎

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند اور یہ سادہ دل فتوح جدید کا آرزو مند۔ پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سو ان کا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر اس سے قطع نظر کی۔ اب سنیے ادھر کی، ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں، تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں اگر گنہ گار ہوں۔ گنہ گار ٹھہرتا گولی یا پھانسی سے مرتا اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں، مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیش گاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھیجا گیا ہے، بقلم چیف سکرتر بہادر اس کا جواب پایا ہے اب کی بار دو کتابیں بھیجیں، ایک پیش کش گورنمنٹ ایک نذر شاہی ہے نہ اس کے قبول سے اطلاع نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف، اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں کہ چیف سکرتر بہادر لفٹیننٹ گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالی شان چیف سکرتر ہوئے۔ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب بہادر لورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحبِ عالی شان چیف سکرتر کا کام کس کو دے گئے۔

۱۷؍ دسمبر ۱۸۵۶ء کو لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے

کے صلے اور جائزے کے واسطے جو بتوسط لارڈ ڈالہین بر اسائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے۔ جو حکم صادر ہو گا سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے۔ یہ حکم ۷ ار دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل توقع میں گزرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب اور دوسرے قصیدے کے جابجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمۂ ولایت کو یاددہی کرتا ہے۔ اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔ جب یہاں سے نوید تحسین نہیں تو ولایت کو نذر کر کے ارسال کا بھی یقین نہیں۔ تحسین اور آفرین سے قطع نظر، نذر کے ولایت جانے کا یقین کیوں کر حاصل ہو؟ جہاں یہ تفرقہ اور بے التفاتی اور دشواری اور یہ مشکل ہو۔

میرے پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کماحقہ، سمجھ لو، والرحمٰن الطاف خفیہ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے یہ بھی لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کے پنشن کے چڑھے ہوئے روپے یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیجدو۔ تاکہ ہم منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں۔ اور وہاں کمشنر صاحب بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپے کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا صاحب یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو۔ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجراء کا حکم مل جائے گا۔ اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر نہ آئے گی۔ میں چپ ہو رہا —— ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ دستنبو منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟

میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ ایک دستنبو نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ نواب بہادر کا خط مقام الہ باد سے بسبیل ڈاک آیا وہ کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات اور یہ بھی توقع پڑی کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔

میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنشن کے اجراء کا حکم دیا۔

زرِ سہ سالہ مجتمع، ہزاروں کہاں سے ہوئے۔ سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں۔ تین برس میں۔ دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار، میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرض دار قدیم ہوں، اب دو ہزار روپے لایا۔ اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اس سے حساب کروایا گیا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دیدو۔ پانسو سات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکادے نو سو باقی رہے۔ آدھے تو لے لے آدھے مجھ کو دے۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے۔ اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں حکم ہو گیا کہ پنشن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ بماہ پنشن نہ تقسیم ہوا کرے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے۔ مگر دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سیکڑہ سالانہ عموماً

وضع ہوا کرے گی۔ اس حساب سے میرے حصہ میں ڈھائی سو روپے مہینہ آیا۔ باسٹھ آنے کے ساکھ رہیں گے۔

اصلاح نظم

رئیس رام پور سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ سال گذشتہ ۱۸۶۳ء ان کو لکھ بھیجا، کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے۔ اور میں اپنے حواس نہیں پاتا ہوں۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجیے تو میں لمبر سہی، ورنہ خیرات خوار سہی، اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر ۱۸۶۴ء تک آ گئی۔ اب آگے دیکھیے کیا ہونا ہے آج تک نواب صاحب ازراہِ جواں مردی دیے جاتے ہیں ؎

وزیر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم
شائستہ گدائی ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں۔ قابل خدمت نہیں اسد
خیرات خواہِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

میرا حال اس سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب یہ حال ہے تو کہو صاحب میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں۔ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔ دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں، صبح کو دو آدمی ہاتھوں پہ لے کر دالان میں لے آتے ہیں ایک کوٹھری ہے اندھیری اس میں ڈال دیتے ہیں تمام دن اس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔

پن کال

دلّی میں پانچ لشکروں کا حملہ ہوا۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج (۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء) اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں۔ تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی کوئی دن نہیں کہ دو چار گھروں کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکان گر گئے، سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے—— گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے، پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے، جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔

برسات خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی، سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے، چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے، کتابیں، قلمدان سب توشے خانے میں فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ برسات ایسی ہوئی کہ میں باون ترپن برس سے رہتا ہوں۔ عرش آرامگاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایک بار ایسی برسات دیکھی تھی یا امسال نظر آتی ہے۔

موسمِ برشگال

اگرچہ یہاں مینہ اس قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصلِ ربیع سے ہاتھ دھولیں۔ مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ (نواب رامپور) پر ہے۔ اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوتی ہے۔ ابر رحمت کے شکریہ میں ایک قطعہ بھیجتا ہوں ؎

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک — رہا ہے روز سے، ابر ستارہ بار برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابر مطیر — بیار، لامیِ گلنار گوں، بیار برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی — درحضور پر، اے ابر، بارہ یار برس
ہر ایک قطرہ کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے — امیر کلب علی خاں، جئیں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں — کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس
جناب قبلۂ حاجات اس بلاکش نے — بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

عذاب النّار

یہاں کا حال کیا لکھوں بقول سعدی علیہ الرحمتہ ؏

نماند آب جز آب چشم در یتیم

شب و روز آگ برستی ہے یا خاک، نہ دن کو سورج نظر آتا ہے نہ رات کو تارے، زمین سے اٹھتے ہیں شعلے۔ آسمان سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں۔ عقل نے کہا کہ دیکھ نادان قلم، انگریزی دیا سلائی کی طرح جل اٹھے گی، اور کاغذ کو جلا دے گی۔ بھائی ہوا کی گرمی تو بری بلا ہے۔ گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے

وہ اور بھی جاں گزا ہے ؎

دن کو دھوپ اور رات کو گرمی　　　　وقنا ربّنا عذاب النّار

ستارۂ دُم دار

اب ضرور آپڑا کہ کچھ حال اس دُم دار ستارہ کا لکھوں ..... بسبب فقدان اسباب یعنی رصد و کتاب کچھ نہیں کہا جاتا۔ ناچار مرزا صاحب کا مصرعہ زبان پر آجاتا ہے۔ ع

ازیں ستارۂ دنبالہ داری ترسم

یہ مطلع ہے اور یہ پہلا مصرعہ ہے۔ ع

زخال گوشۂ ابروئے یار می ترسم

کیا آپ مجھ کو بے ہنری اور ہیچ میرزی میں صاحبِ کمال نہیں جانتے اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداقِ حال نہیں مانتے۔ پیش ملّا طبیب و پیش طبیب ملّا۔ پیش ہیچ ہر دو پیش ہر دو ہیچ۔ آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوّف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیِ طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔ بہر حال علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانہ کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس طرح برج میں یہ نظر آئے اسی کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور ان دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نہ معلوم ہوئی۔ بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی۔ اب دہ دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قران النحسین پھر کسوف پھر خسوف۔ پھر یہ صورت پُر کدورت لمیاذ اباللہ و نیاہ بخدا عیاذاً باللہ۔

واہ رے بندر اور پھر شہر کے اندر

پنجشنبہ ۲۵ مئی ۱۸۶۵ء کو بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا، وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبے کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابلِ عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام گمزی کہتے ہیں، انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی، واہ رے بندر یہ زیادتی پھر شہر کے اندر۔

وبا

وبا کو کیا پوچھتے ہو، وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا!

حصّہ دوم

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو

فارسی کا دیوان
پنج آہنگ
مہر نیم روز
دستنبو
قاطع برہان
درفش کاویانی
لطائف غیبی
سبد چین
نامہ غالب
اردو کا دیوان

فارسی کا دیوان

فارسی کا دیوان دس ہزار بیت کا ہے۔ بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا۔ پھر نہیں چھپا۔ مگر ہاں سال گذشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیا الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔ وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا، وہ پچاس جزو ہیں یعنی کوئی مصرع میرا ان سے خارج نہیں۔ اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپیہ کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو ہنڈی بھیج کر بیس جلدیں منگوالوں۔

پنج آہنگ، مہر نیمروز، دستنبو، قاطع برہان، دیوان اردو۔ یہ پانچ رسالے البتہ کتب میں شمار کیے جائیں۔ باد مخالف ایک مثنوی ہے۔ من جملہ ان مثنویوں کے جو کلیات نظم فارسی میں مندرج ہیں بجائے خود کتاب نہیں ہے۔ مثنوی ابر گہر بار بھی کلیات میں موجود ہے ——— ایام شباب میں کہ بحر طبع روانی پر تھا جی میں آیا کہ غزوات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستان طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار اس آٹھ سو نو سو شعر کو چھپوا لیا۔

پنج آہنگ

میرا ایک نسبی بھائی ہے۔ نواب ضیا الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہا۔ چنانچہ مجموعۂ نثر اور کلیات نظم اردو سب نسخہ اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں، بیس ہزار کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا، ایک ورق نہیں رہا ———

اس چھاپے کی پنج آہنگیں معیوب اور بد عیب ہیں، ایک تو یہ کہ بعد انطباع از قسم نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں۔ دوسرے کاپی نولیس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے

کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے، بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

مہرِ نیم روز

اکثر صاحب اطراف وجوانب سے "ماہ نیم ماہ" بھیجنے کا حکم دیتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب مہر نیم روز کی عبارت کو نہیں سمجھے تو 'ماہ نیم ماہ' کو لے کر کیا کریں گے۔ مہر نیم روز کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام پرتوستان ہے اور اس کی دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت کا ذکر۔ دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصہ کا نام مہر نیم روز ہے، دوسرے حصے کا نام 'ماہ نیم ماہ' ہے۔ بارے پہلا حصہ تمام ہوا۔ چھاپا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تیمر تک کا نام ونشان مٹ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد وگاؤ را قصاب برد وقصاب درراہ مرد۔ جو کتاب میں نے لکھی ہی نہ ہو وہ بھیجوں کہاں سے؟ وہ آسمان ٹوٹ پڑا جس پر 'ماہ نیم ماہ' طلوع کرتا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح مسافر سفر میں آدھی منزل طے کر کے دم لیتا ہے۔ میں نے ہمایوں تک کا حال لکھ کر دم لیا تھا۔ قصد تھا کہ اب جلال الدین اکبر کی سلطنت کا حال لکھوں گا، ناگاہ یہ فتنۂ عظیم رونما ہوا۔ عرفت ربّی بفسخ العزائم۔

دستنبو

میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے اکیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔ صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ التزام اس کا کیا ہے

کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی کا نہ آوے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً "منشی ہرگوپال تفتہ" منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ "شیوہ زبان" لکھ دیا ہے۔

میرا خط نہ چھدرا نہ گنجان، اوراق بے سطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس اور کسی صفحے میں بائیس سطر بلکہ کسی میں انیس بھی آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستایش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جز کی کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیرؔ اور مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ اور منشی ہرگوپال تفتہؔ کے اہتمام میں چھاپی گئی

منشی امید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہؔ تھا۔ اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہؔ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی۔ فارسی قدیم اور پھر حسن معنی اور صنعت الفاظ۔ بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزرائے ملکہ دارا دربان کے دو سرٹیفکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے تو اسی کتاب موسم بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے۔

اگر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی اور میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبان انگریز

کی خریداری آئی ہوگی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی۔ پورب میں کم بکی ہوں گی۔ میں نے ایک بار ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری منگوائی۔ پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو بھجوائیں اور اس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں سردھنے کو بھجوائیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور لے چکا ہوں مگر نقد، ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائیں۔

دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی۔ اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی، ان کی صورت میں ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ پھر سمجھنا چاہیے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں۔ نواب گورنر جنرل بہادر چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بدوضعی ہے کہ جناب ایڈمنسٹن بہادر کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ ایک جگہ ان کی نذر بہت ضروری ہے۔ ۲۲ کتابیں بھیجی ہوئی منشی شیو نرائن کی۔ جمعہ کے دن ۱۲ر نومبر ۱۸۵۸ء کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے ازروئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی۔ حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو برآئی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصوّر میں کبھی نہیں گذرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس قسم کی ہوں گی۔

بندہ نے دستنبو جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی۔ سوان کے فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفریں و اظہار خوشنودی ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹنٹ گورنری کو قصیدہ بھیجا۔ اس کی رسید، نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل

ڈاک آ گیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح اور تہنیت جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آ گیا۔ پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔

قاطع برہان

اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا ہزار ہا لفظ غلط، ہزار ہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر یہ ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ہے۔ جو صاحب اس کو دیکھیں گے وہ ہرگز نہ سمجھیں گے صرف قاطع برہان کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فنِ لغت جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم ہو، چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو، پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو۔ معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

نہ میں ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے۔ دیباچہ اور خاتمے میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ طرزِ عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش ظرافت سے خالی نہ ہوگی۔ گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی ؎

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن بچپن سے محوِ سخن گزاری ہوں، مبدءِ فیاض کا

مجھ پر احسانِ عظیم ہے، ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کے منطق کا بھی مزا ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد و تربیت استاد سے حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا۔ فارسی کے غوامض جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا۔

قاطع برہان کا لکھنا کیا تھا گویا باسی کڑھی میں ابال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہوا۔ ہے ہے یہ تنک، یہ معارض اکابر سلف ہوا، ایک صاحب فرماتے ہیں کہ قاطع برہان کی ترکیب غلط ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ حضرت برہان قاطع و قاطع برہان ایک نمط ہے۔ برہان قاطع نے کیا۔ لٹھا نینونین سکھ قطع کیا ہے جو آپ نے اس کو قاطع کا لقب دیا۔ برہان جب تک غیر کی کسی برہان کو قطع نہ کرے گی کیوں کر برہان قاطع نام پائے گی —— برہان قاطع کی صحت میں جتنی تقریر کیجئے گا، وہ قاطع برہان کی صحت کے ثبوت میں کام آئے گی۔ ۱۸۶۲ء میں برہان قاطع چھپی، پچاس جلدیں میں نے مول لیں۔

ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ دکن کا آدمی یعنی جامع برہان قاطع احمق اور غلط فہم اور معوج الذہن، مگر قسمت کا اچھا ہے مسلمان اس کے قول کو آیت اور حدیث جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالب مندرجہ بید کے برابر مانتے ہیں۔

میرے پاس روپیہ کہاں جو قاطع برہان کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے بھی نواب مغفور (یوسف علی خاں ناظم) نے دو سو روپے بھیج دیے تھے۔ تب پہلا مسوّدہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو پہنچیں گے۔ وہ آخر اپریل ۱۸۶۵ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا مصرف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ اس محروم کا وعدہ سر رشتہ دفتر سے نہ تھا جو از روئے دفتر اس کی تصدیق ہو۔

درفش کاویانی:۔ قاطع برہان میں اور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا اور

درفش کاویانی اس کا نام رکھا اور اس کو چھپوایا۔ رامپور سے آکر تین سو جلدیں درفش کاویانی کی تیار پائیں۔

لطائف غیبی

میں نے اپنے صرفِ زر سے لطائف غیبی کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالکِ مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں بیس میں نے مول لے لیں بیس بھائی ضیاءالدین نے لے لیں۔ دس مصطفیٰ خاں صاحب نے لے لیں۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں۔

سبد چین

میں نے سبد چین کی ایک جلد مع عرضی، اقبال نشان میر تفضیل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی۔ سو حضور پرنور مہاراو راجہ بہادر کا خط انھیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے ازراہِ بندہ پروری و قدر افزائی القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت و التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔

نامہ غالب

نامہ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہوگیا ہے کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں وائے اس ہیچ پوچ جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزو وقار ہو۔ نامہ غالب صاحب مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی۔ میں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں۔ دور و نزدیک بانٹ دیں۔

اردو دیوان

میرا کلام کیا نظم کیا نثر، کیا اردو کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے۔ اسی میں وہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی۔ ایک

غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا کہ رونا آیا۔ غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — ایک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لے کے دلستاں روانہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں بھی میرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

اردو کے دیوان چھاپے کے بہت ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ لٹ گئے۔ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔

ایک دوست کے پاس اردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بہم پہنچا لیے ہیں۔ چنانچہ "پنہاں ہوگئیں"، "ویراں ہوگئیں" یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آگئی ہے۔ دیوان اردو چھپ گیا ہے۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا متوسط جو میرے پاس کاپی لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے۔ حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم مرزا امو جان مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلی شہر میں رائے مان کے کوچے میں مصوروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت چھ آنے، محصول ڈاک خریدار کے ذمہ۔

دیوان ریختہ اس عرصہ میں (بعد غدر) دلی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔

حِصّہ سوم

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اندازِ بیان
طرزِ بیدؔل
الّو
کلامِ معجز نظام
خدا کا مقہور
ہجر میں وصال
شاعرِ سخن سنج
آفتابِ لبِ بام

انداز بیان

اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادرا دربرگزیدہ خیالات کی جویا تھی۔ لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تران لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے، دیکھا کہ میں باوجود اس کے ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلودہ نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ رہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاصِ چال میں کبک ہے نوراگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز عنقا۔

شنیدم کہ در دورِ گاہِ کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گزشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید — سرِ چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد ز کار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید
ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

یہ مثنوی ناظم کی ہے اس میں آخری شعر غالب نے بڑھا دیا ہے۔

طرزِ بیدل

ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کر دیئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیئے۔

الّو

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش مرحوم نے ایک نئی زمین نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب جو دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل کر کے بنائی ہے۔ اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور مطلع اور ایک شعر میرا اور باقی کسی الّو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو

مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔

کلام معجز نظام

حاشا ثم حاشا اگر یہ غزل میری ہو۔ ؏

اسدؔ اور لینے کے دینے پڑیں گے

اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے ؎

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسدؔ ہو گزرے ہیں یہ غزل ان کے کلام معجز نظام سے ہے۔ اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسدؔ تخلص رکھا ہے۔ ورنہ غالبؔ ہی لکھتا رہا ہوں۔ اسدؔ اور شیر، اور بت اور خدا، اور جفا اور وفا، یہ میری طرز گفتار نہیں۔

میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی...... بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہیں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل، قصیدہ کہنے لگا۔ شاعری معنی آفرینی ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

خدا کا مقہور

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں　　ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اگرچہ یک فنہ ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم ونثر کی داد باندازۂ بالیست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا ؎

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ، مراہم زباں نہیں

قلندری وآزادگی وایثار وکرم کے جو داعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لو اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی جس شہر میں رہوں اسی شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو	ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے	کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار	اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ	نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط	نہ غوغائے رامشگراں در نشاط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام وکمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتا نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت انزاتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیں خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ اپنے کو شاہ قلمروِ سخن جانتا تھا۔ "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رہا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں جی نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا۔ بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑے، میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا کہاں سے دوں گا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

چراغ بے نور

فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔ ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

سب کو جن سے خط و کتابت رہتی ہے، اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔

جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے، ان میں جو صاحب الی آلان ذی حیات موجود ہیں۔ ان سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروّج میں مکاتیب و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں، رسالوں، نسخوں اور کتابوں کے مجموع شیرازہ بستہ چھپا یا ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے۔ جاں کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق بار سے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموع و یکجا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں۔ انھیں کو جناب احدیت جلّت عظمتہ، مقبول قلوب اہل سخن و مطبوع طبائع ارباب فن فرمائیے۔

اگلوں کے خطوط تحریر کی طرز —— ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھوں وہ خط ہی نہیں ہے، چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے۔ خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے، ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو، تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں امر ضروری لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔

میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے سہارے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا۔ میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو، میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔

ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیئے۔ ڈاک کا ہرکارہ جو بلّی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے۔

ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا تھا، حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے، میں بالاخانے میں رہتا ہوں، حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو۔ آپ کو جیسا کہ بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا۔ اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامہ غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز کیشاں" لکھا تھا۔ اس قرم ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کرکے "کیشاں" کو "کپتان" پڑھا۔

میں کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔ عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں، علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبدءِ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے۔ اور اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو دو سو چار سو آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔

اہلِ ہند میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ نظامی، سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں ہندیوں کو کیوں کر مسلّم الثبوت جانیں۔ گائے بچہ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔

ایک سپاہی زادہ ہیچمدان اور دل افسردہ و رواں فسردہ، ہاں ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری   کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

.....یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کے پرواز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پائیے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں؟ اور ان کا کلام وحی ہے؟ اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں، میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔

شعرائے ایران کلیم اجمعین مسلّم الثبوت ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ سخنورانِ ہند میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں۔ اہل ایران میں رودکی، فردوسی سے لے کر جامی تک اور جامی سے صائب و کلیم تک کسی نے لغت کی کوئی کتاب لکھی ہو، کوئی فرہنگ جمع کی ہو تو ہمیں دکھاؤ۔ اس کو اگر نہ مانوں اور سند نہ جانوں تو گنہ گار۔

جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں نام ان کے کہاں تک لوں مشہور و غیر مشہور کچھ کم سو رسالے ہوں گے۔ ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہل زبان نہیں ہے۔ اشعار اساتذۂ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے۔ بمناسب مقام ان لغات کے معنی لکھ دیئے۔ استنباط معنی کا مدار قیاس پر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ قیاس ان کا سراسر غلط ہے۔ میرا قول یہ ہے کہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط۔

شاعر سخن سنج

کہتے ہیں خدا سے نومیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافر مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی، نہ دنیا نہ دین۔

اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار، میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں، بناوٹ

نہ سمجھنا شعر کہنا بالکل مجھ سے چھوٹ گیا، اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ کی ہے، شعر سننا تو ممکن ہی نہیں۔ شعر دیکھنے سے نفرت ہے، پچھتر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد، بقول انوری ؎

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح

وے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شعرا اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں۔ اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔

آفتابِ لبِ بام

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ۔۔۔ وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ۔۔۔ ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا ۔۔۔ شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں ۔۔۔ میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ

اب عناصر میں اعتدال کہاں

میں تو اب روز و شب اسی فکر میں ہوں کہ زندگی یوں گزری اب دیکھئے موت کیسی ہو ؎

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

زندہ ہوں مردہ نہیں، بیمار بھی نہیں، بوڑھا ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرا، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار، غالب۔

بات یہ ہے کہ میں اب رنجور نہیں، تندرست ہوں، مگر بوڑھا ہوں، جو طاقت باقی تھی وہ اس ابتلا میں زائل ہو گئی اب ایک جسم بے روح متحرک ہوں۔ ع

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

اچھا ہوں، مگر بیمار، عوارض میں گرفتار، بوڑھا، بہرا، اپاہج، بدحواس۔ ناتواں فلک زدہ آدمی ہوں۔

پیری وصد عیب، ساتویں دہا کے مہینے گن رہا ہوں، قولنج آگے دوری تھا، اب دائمی ہو گیا ہے۔ مہینا بھر میں پانچ سات فضول مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاء حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے اگر معدوم نہ کہو تو بمنزلہ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا، ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں۔ جس کی شرارت سے بھنا جاتا ہوں۔ اگرچہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں۔

بھائی اب میری انگلیاں نکمی ہو گئیں ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے دو سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خطوط آئے دھرے رہتے ہیں، جب کوئی دوست آجاتا ہے۔ میں اسے جواب لکھوا دیتا ہوں۔

آگے اتنی طاقت پائی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ طاقت بھی زائل ہو گئی۔ ہاتھ میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی ضعیف ہو گئی، متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں، دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آ گئے، تو میں مطلب کہتا گیا وہ لکھتے گئے۔

میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں۔ اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے کھانا مطلق نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے۔ نہ کھانا

دن کو میسر ہے، نہ رات کو شراب، حرارت، مزاج سب بہت ہے ناچار احتراز کرتا ہوں۔ اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے، ہرگز بھوک نہیں لگی اور اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔

اعضاء فرسودہ اور بودے ہو گئے۔ روح ان میں دوڑتی نہیں پھرتی مگر ابھی مفارقت نہیں کرگئی۔ اعضاء نکمے ہو گئے اب وہ کام جوان سے متعلق تھے بند ہو گئے۔

اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا۔ دن رات پڑھتا ہوں، حاجتی پلنگ کے تلے دھری رہتی ہے، طشت چوکی پلنگ کے پاس لگا رہتا ہے۔ سو طشت چوکی پر تیسرے چوتھے دن اتفاق جانے کا ہوتا ہے اور حاجتی کی حاجت بسبب سرعت بول کے گھنٹہ بھر میں پانچ چھ بار ہوتی ہے۔

آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق، رعشہ مستولی، حافظہ معدوم، مشہور یہ ہے کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے مولیٰ کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے، ایسے میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدارِ غذا تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔ ستّر بہتّر اردو میں ترجمہ پیرخرف ہے، میری تہتّر برس کی عمر ہے پس میں اخرف ہوا۔ گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی طرح معدوم ہو گیا۔ اب مہینے بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں ؎

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
تنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

مختصر کہتا ہوں — میری غذا.... تندرستی سب کیا ہے۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پتا آلو بخارے

کا افسردہ اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگیا ہے۔ اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔

مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا۔ بائیں پاؤں میں ورم کف پا سے پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک اماس، کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگیں۔ خیر اٹھا روٹی کھانے محلسرا نہ گیا، کھانا یہیں منگا لیا۔ پیشاب کو کیوں کر نہ اٹھوں۔ حاجتی رکھ لی۔ بغیر اکڑوں بیٹھے بات نہیں بنتی۔ پاخانے کو اگرچہ دوسرے تیسرے دن جاؤں مگر جاؤں تو سہی یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گذرتی ہو گی۔ ؎

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا مصرعہ بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں۔ ؎

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

اب مرگِ ناگہاں کہاں رہی۔ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔

میں برس دن سے بیمار اور تین مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت مفقود۔ پھوڑوں سے بدن لالہ زار، پوست سے ہڈیاں نمودار، پھوڑے ایسے جیسے انگارے سلگتے ہیں۔ اعضا پر دس جگہ پھائے لگتے ہیں۔ ضعف و ناتوانی علاوہ، سوز غمہائے نہانی علاوہ ؎

پیری و نیستی خدا کی پناہ

دست خالی و خاطر غمگیں

رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہتر واں برس شروع ہوا .... اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چار پایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ مہندا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔ بعد اراقہ بول بے تکلف نیند آجاتی ہے۔

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں حالی،

گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، دور دراز رستہ ہے۔ زادراہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں ؎

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں، ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اب میں انتہائے عمر کو پہنچ گیا آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یاد خدا ابھی چاہیے نظم و نثر کے قلم کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام روشن رہے گا ؎

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا ہے۔ اب عالم بیرنگی کا مشتاق ہوں۔

رند شاہد باز

ہر دم نزع ہے، دل غم سے خون ریز ہو گیا ہے۔ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں۔ اور نجات کا طالب ہوں ؎

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

کمال یاس مقتضی استغنا ہے۔ پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ باامید مرگ جیتا ہوں، اس راہ سے کچھ مستغنی ہو چلا ہوں کہ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح سے گذر جائے گی ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

جانتا ہوں کہ ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے، مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھیے چاہے اوہام۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے ؎

من کہ باشم جاوداں باشم | چوں نظیری نماند طالب مرد
در بگو بند در کداں سال | مرد غالبؔ بگو کہ "غالب مرد"

اب بارہ سو چھتر ہے اور غالبؔ مرد بارہ سو ستتر ہیں (۱۲۷۷ھ)۔ اس عرصہ میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو، پہنچ لے۔ ورنہ پھر ہم کہاں۔

۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔

بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں ہے۔ نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں۔ بس اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا، کل بچا پرسوں مرا ؎

دم واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو بس، اللہ ہی اللہ ہے

ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کروں، جیسے ابرِ سیاہ چھا جاتا ہے۔ یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

———— ❊ ————

حصّہ چہارم

کھلتا کسی پہ کیوں، مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

"اردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے کہ
حضرت (نواب کلب علی خاں) کی نظرِ انور سے گزر گیا ہو...."

غزلیات

(۱)

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے! — سینۂ شمشیر سے باہر ہے، دم شمشیر کا
بسکہ ہوں، غالبؔ، اسیری میں بھی آتش زیرِپا — موئے آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا

(۲)

کہتے ہو "نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا" — دل کہاں کہ گم کیجیے؟ ہم نے مدعا پایا
عشق سے، طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم — آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

(۳)

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ، غافل! بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

(۴)

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد — کام یاروں کا، بقدرِ لب و دنداں نکلا
تھی نوآموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

(۵)

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے، ترا کاکلِ سرکش نہ دبا — یہ زمرّد بھی، حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر، مرے مرنے پہ بھی، راضی نہ ہوا

(۶)

ستائش گر ہے، زاہد اس قدر، جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے، ہم بیخودوں کی طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے، بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا!
کہ ہر یک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی، مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے، میرے درباں کا
ہنوز، اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ، گویا، حجرہ ہے، یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا، خواب میں آکر، تبسّم ہائے پنہاں کا؟

(۷)

محبّت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے، ناک میں آتا ہے دم میرا

(۸)

محرم نہیں ہے تو ہی، نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز — میں اور دُکھ تیری مژہ ہائے دراز کا

ہیں، بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے — ہر گوشۂ بساط، ہے سر شیشہ باز کا

(۹)

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا — اس تکلف سے کہ، گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؟ — آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں، گو نہ پاؤں اس کا بھید — پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں، حسنِ عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے، میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر، نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال — نامہ لاتا ہے وطن سے، نامہ بر اکثر کھلا

اس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے، غالبؔ، گنبدِ بے در کھلا

(۱۰)

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — شعلۂ جوالہ، ہر یک حلقۂ گرداب تھا

نالۂ دل میں شب، اندازِ اثر نایاب تھا — تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے، دل کیا نشاط آہنگ ہے — خانۂ عاشق، مگر، سازِ صدائے آب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے — کل تلک، تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا — انتظارِ صید میں، اک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے — اس کے سیلِ گریہ میں، گردوں کفِ سیلاب تھا

(۱۱)

ایک ایک قطرہ کا مجھے، دینا پڑا حساب — خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو، کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب — دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا

(۱۲)

بسکہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں، انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے، بیاباں ہونا

کی، مرے قتل کے بعد، اس نے جفا سے توبہ — ہائے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف! اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو، عاشق کا گریباں ہونا

(۱۳)

نالۂ دل نے دیے، اوراقِ لختِ دل، بباد
یادگارِ نالہ، اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

(۱۴)

دوست، غمخواری میں میری، سعی فرماویں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور! کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے کیا؟
حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟

(۱۵)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدہ پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا؟
غم اگرچہ جاں گسل ہے، یہ کہاں بچیں، کہ دل ہے — غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا؟
اسے کون دیکھ سکتا؟ کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسایلِ تصوف، یہ ترا بیان، غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا؟

(۱۶)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا، کیا — نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟ — کہاں تک، اے سراپا ناز "کیا کیا"؟
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافلہائے تمکیں آزما کیا؟
نفس، موجِ محیطِ بیخودی ہے — تغافلہائے ساقی کا گلا کیا؟
دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ "انا البحر" — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟
محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟
سن، اے غارت گرِ جنسِ وفا! سن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

(۱۷)

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا، نہ ہوا — پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا؟
بندگی میں بھی، وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سینہ کا داغ ہے، وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے، جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا — کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بنِ مو سے، دمِ ذکر، نہ ٹپکے خوناب — حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے، اور جزو میں کُل — کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

(۱۸)

زکاتِ حسن دے، اے جلوۂ بینش! کہ مہر آسا — چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا
وہی اک بات ہے، جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے — چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(۱۹)

زہرہ گر ایسا ہی، شامِ ہجر میں، ہوتا ہے آب — پرتوِ مہتاب، سیل خانماں ہو جائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا؟ — یعنی، یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا — مجھ پہ، گویا، اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
وائے! گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو — اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

(۲۰)

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی، گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ — بندگی میں، مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رک گیا، روا نہ ہوا
رہزنی ہے، کہ دلستانی ہے — لے کے دل، دلستاں روانہ ہوا

(۲۱)

دل اس کو، پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا ؟
فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اس کو یاد، اسدؔ
جفا میں اس کی، ہے انداز کارفرما کا

(۲۲)

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

(۲۳)

میں، اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا ؟
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں، غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

(۲۴)

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلا کیا ؟ یہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

(۲۵)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا، کہ یوں ہوتا، تو کیا ہوتا ؟

(۲۶)

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

(۲۷)

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل، تادمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضاء اس قدر آساں سمجھا

(۲۸)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال — دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے، گھر یاد آیا

(۲۹)

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گلا — اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں؟ — کبھی فتراک میں تیرے، کوئی نخچیر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں، وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی — آخر، اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں، فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

(۳۰)

تو دوست کسی کا بھی، ستمگر! نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح، دستِ قضا نے — خورشید، ہنوز، اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمّت ہے، ازل سے — آنکھوں میں ہے، وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی، تنک آبی سے، ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی، ابھی، تر نہ ہوا تھا

(۳۱)

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں؟
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منّتِ کیموس تھا

(۳۲)

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو، اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے — اس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا

(۳۳)

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
مرنے کی، اے دل! اور ہی تدبیر کر، کہ میں — شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں، شوق نے، بندِ نقابِ حسن — غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا

(۳۴)

رشک کہتا ہے کہ "اس کا غیر سے اخلاص، حیف!" — عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا؟"
میں، اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی کہ ہے — عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

(۳۵)

ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب، آخر، تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب — آج ہی ہوا منظور، ان کو امتحاں اپنا

منظر اک، بلندی پر، اور ہم بنا سکتے — عرش سے ادھر ہوتا، کاش کے، مکاں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں ان کو دکھلادوں — انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا — ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے؟ — بے سبب ہوا غالبؔ، دشمن آسماں اپنا

(۳۶)

سرمۂ مفتِ نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

(۳۷)

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے، عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے — پرگل، خیالِ زخم سے، دامن نگاہ کا

(۳۸)

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا؟ — کہتے ہیں "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟"
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا؟
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟ — یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟
عمر بھر، دیکھا کیا مرنے کی راہ — مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا؟

پوچھتے ہیں وہ کہ "غالبؔ کون ہے؟"
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(۳۹)

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں میری صورتِ قفلِ ابجد — تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ، اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

(۴۰)

جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی، ہے بالِ ہما، موجِ شراب

(۴۱)

افسوس! کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر، انگشت

(۴۲)

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت — پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے، عشقِ خونابہ مشرب — لکھے ہے، "خداوندِ نعمت سلامت"
علی الرّغم دشمن شہیدِ وفا ہوں — مبارک، مبارک! سلامت، سلامت

(۴۳)

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے، پر کس وقت

(۴۴)

عشق میں، بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں، آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ مارروشن! کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُر خوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ، ز بس تکرارِ دوست

(۴۵)

اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام! چل
سیلابِ گریہ، درپئے دیوار و در ہے آج

(۴۶)

لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج

(۴۷)

حسن، غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے، تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل، خاک میں، احوالِ بتاں پر یعنی — ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق؟" — ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا، میرے بعد
غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

(۴۸)

بلا سے، ہیں جو یہ پیشِ نظر، در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
نہیں ہے سایہ، کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں، تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے، بِن تیرے، گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم، دیکھ کر در و دیوار

(۴۹)

گھر جب بنا لیا ہے ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر؟

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

(۵۰)

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر؟
جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے، تری رفتار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ، متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو، چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ، غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

(۵۱)

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے، تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہائے دل، نمکداں پر

مجھے، اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر

نہ لڑ ناصح سے، غالب، کیا ہوا گر اس نے شدّت کی؟
ہمارا بھی تو، آخر، زور چلتا ہے گریباں پر

(۵۲)

ہے بسکہ، ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبّت، تو گزرتا ہے گماں اور

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجکو زباں اور

تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم؟ جب اٹھیں گے
لے آئیں گے، بازار سے جاکر، دل و جاں اور

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ! ہرچند سر اڑ جائے
جلاّد کو، لیکن، وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

(۵۳)

نہ کی، سامانِ عیش و جاہ نے، تدبیرِ وحشت کی
ہوا، جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ، آخر

(۵۴)

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی؟
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے، میری گردن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے، تہمت نگہ کی، چشم روزن پر

(۵۵)

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں، در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ، کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے، مرنے کی تمنا، کوئی دن اور

(۵۶)

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز؟
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟
دل سے نکلا؟ پہ نہ نکلا دل سے
ہے، ترے تیر کا پیکان، عزیز
تاب لائے ہی بنے گی، غالبؔ
واقعہ سخت ہے، اور جان، عزیز

(۵۷)

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

(۵۸)

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، ہے، ہے
خوب وقت آئے تم، اس عاشق بیمار کے پاس
دیکھ کر تجکو، چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس
مرگیا پھوڑ کے سر، غالبِ وحشی ہے، ہے
بیٹھنا اس کا وہ، آ کر تیری دیوار کے پاس

(۵۹)

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا، نمک
داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی، واہ، واہ
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک
یاد ہیں غالب، تجھے وہ دن، کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

(۶۰)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

(۶۱)

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے، بہار
میرا رقیب ہے، نفسِ عطر سائے گل
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار، دوڑے ہے گل در قفائے گل

(۶۲)

غم نہیں ہوتا آزادوں کو، بیش از یک نفس
برق سے، کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ، ہم
دایم الحبس اس میں ہیں، لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں، سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ، ہم

(۶۳)

مجکو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے، مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہائے زلف کمیں میں ہیں، اے خدا رکھ لیجو، میرے دعویٰ وارستگی کی شرم

(۶۴)

لوں دام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے غالبؔ، یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں؟

(۶۵)

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں؟
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو، اہلِ نظر "قبلہ نما" کہتے ہیں
دیکھیے، لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ؟ اس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

(۶۶)

آبرو کیا خاک اس گل کی، کہ گلشن میں نہیں؟
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں
ضعف سے، اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے، اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا، ناتوانی کی نمود؟
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

(۶۷)

عہدے سے مدحِ ناز کے، باہر نہ آسکا
گر ایک ادا ہو، تو اسے اپنی قضا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن، کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے، ہے! خدا نکردہ! تجھے بے وفا کہوں

(۶۸)

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں، کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں، طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟
بات، کچھ سر تو نہیں، کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجکو، ستمگر، ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی، کہ کھا بھی نہ سکوں

(۶۹)

ہم سے کھل جاؤ، بوقتِ مے پرستی، ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر عذرِ مستی، ایک دن

(۷۰)

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
ایک چھیڑ ہے، وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا؟
پرسش ہے، اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

ہر چند جانگدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں، مطربِ ترانۂ "ہَل مِن مزید" ہے — لب، پردہ سنجِ زمزمۂ "الاماں" نہیں
خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دونیم — دل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتشکدہ نہ ہو — ہے عارِ دل، نفس اگر آذرفشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمیں کے بدلے، بیاباں گراں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ، ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیمجاں نہیں

(۷۱)

مانعِ دشت نوردی، کوئی تدبیر نہیں — ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں، زنجیر نہیں
سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے — لذّتِ سنگ، باندازۂ تقریر نہیں

(۷۲)

مت، مردمکِ دیدہ میں، سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع، سویدائے دلِ چشم میں آہیں

(۷۳)

برشگالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے
کھِل گئی، مانندِ گل سو جا سے، دیوارِ چمن

(۷۴)

ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
کہتے ہیں "جیتے ہیں امید پہ لوگ" — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

(۷۵)

ترے سروِ قامت سے، اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

(۷۶)

ملتی ہے خوئے یار سے، نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں اور خطِ وصل، خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی، اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے، شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر، مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے، سفینہ رواں ہو سراب میں

(۷۷)

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

(۷۸)

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہ گذر کو میں

ہے کیا، جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں؟

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے"
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں، ابھی، راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں؟

(۷۹)

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے، جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمھیں"
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

(۸۰)

نالہ جز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب
ہم کو تسلیم، نکو نامیٔ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوِش، گویا
دی ہے، جائے دہن اس کو دمِ ایجاد، نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے، بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں

(۸۱)

دونوں جہان دے کے، وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے، ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں

(۸۲)

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

(۸۳)

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام؟ — دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم ان کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ؟ — یہ کیا کہ تم کہو، اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"؟

(۸۴)

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم — اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

(۸۵)

دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

(۸۶)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے، اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

(۸۷)

دیوانگی سے، دوش پہ زنّار بھی نہیں — یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں، اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے، اے خدا — لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

(۸۸)

نہیں ہے زخم کوئی، بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے، ہر قطرہ خوں تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی؟
شبِ مہ ہو جو رکھ دوں پنبہ دیواروں کے روزن میں
ہزاروں دل دیے، جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر، سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

(۸۹)

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں — سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر، ہوا اڑا لے جائے — وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

(۹۰)

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟
دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟
قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟
واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟
غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے، ہائے کیوں؟

(۹۱)

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ "یوں"؟
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ "یوں"
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں، خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ "یوں"!

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"
سن کے، ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ "یوں؟"

(۹۲)

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے، ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

(۹۳)

کعبہ میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو؟

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو، کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں، رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالب، کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

(۹۴)

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو؟
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو؟

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو؟

"پیدا ہوئی ہے" کہتے ہیں، "ہر درد کی دوا"
یوں ہو، تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو؟

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو؟

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو؟

(۹۵)

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے؟
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزوے دوست دشمن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا، شناور جوے خوں میں، تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب، کاں میں، جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا؟
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

۹۶

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

(۹۷)

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

(۹۸)

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے، ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے، ہم کو

(۹۹)

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو؟

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے — قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں؟ — مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید؟ — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست — لیکن خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو

(۱۰۰)

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو؟ — کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہو؟
تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا — بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیوں کر ہو؟
الجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ — جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو، تو کیوں کر ہو؟
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیوں کر ہو؟

(۱۰۱)

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟
کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا راز داں کیوں ہو؟
وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالب
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

(۱۰۲)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے — بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات چاہیے
سیکھے ہیں، مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟ — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

(۱۰۳)

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے، بانداز چکیدن سرنگوں، وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغ جفا پر ناز فرماؤ،
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجے؟
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

(۱۰۴)

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہرچند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

(۱۰۵)

تا، ہم کو شکایت کی بھی، باقی نہ رہے جا — سن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب، ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو — وہ سن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

(۱۰۶)

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا؟
وہ جو رکھتے تھے ہم، اک حسرتِ تعمیر سو ہے

(۱۰۷)

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب؟
قسم کھائی ہے، اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا، ظالم! مگر تمہید جانے کی

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں! غالبؔ
بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

۱۰۸

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتوے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ہے، بارے، اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نا مہربان ہے

۱۰۹

کس طرح کاٹے کوئی، شبہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے، ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تس پر یہ نا امیدواری ہائے، ہائے

(۱۱۰)

سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ "مرنے کی آس ہے"
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
پی جس قدر ملے، شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

(۱۱۱)

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
ہے، ہے، خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے
ہستی کے مت فریب میں آ جائیو، اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(۱۱۲)

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

(۱۱۳)

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا
ظاہرا، کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

(۱۱۴)

خزاں کیا! فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ، اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا، کس نے دیکھا ہے؟

(۱۱۵)

پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے — نالہ، گویا، گردشِ سیارہ کی آواز ہے

(۱۱۶)

عشق مجھکو نہیں، وحشت ہی سہی — میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟ — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی، تری عادت ہی سہی

(۱۱۷)

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے — صبحِ وطن، ہے خندۂ دنداں نما مجھے
مستانہ، طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال — تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
کرتا ہے، بسکہ، باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

(۱۱۸)

اس بزم میں، مجھے نہیں بنتی حیا کیے — بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا — میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے؟"
ضد کی ہے اور بات، مگر خو بری نہیں — بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
غالب، تمھیں کہو کہ "ملے گا جواب کیا؟" — مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

(۱۱۹)

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو، برق آفتاب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
میں، نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟ — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا، اسدؔ، مسرتِ پیغامِ یار سے — قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

(۱۲۰)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق، اور وہ بیزار — یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش! پوچھو کہ "مدعا کیا ہے؟"
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — ق — پھر یہ ہنگامہ، اے خدا! کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ — مفت ہاتھ آئے، تو برا کیا ہے؟

(۱۲۱)

کہتے تو ہو تم سب کہ "بتِ غالیہ مو آئے" — یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"
ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت — کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم — آنا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے — ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں آئے
ہاں! اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت؟ — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اس در پہ نہیں بار، تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے، مگر مجھکو ڈبو آئے
اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ — ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

(۱۲۲)

پھر، کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر، جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
پھر، اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر، وہی زندگی ہماری ہے
بے خودی بے سبب نہیں، غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(۱۲۳)

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے، لذّت زندگانی کی

(۱۲۴)

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں — تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
نالے، عدم میں، چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آکے دم ہوئے

(۱۲۵)

دیکھنا قسمت، کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
غیر کو، یارب! وہ کیوں کر منع گستاخی کرے!
گر حیا بھی اس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہردم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دورِ چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ، واہ
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے
اس کی بزم آرائیاں سُن کر، دلِ رنجور، یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر، بیٹھا جائے ہے
ہو کے عاشق، وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

(۱۲۶)

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ، غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۱۲۷

سادگی پر اس کی، مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا، کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے، و لے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

(۱۲۸)

دل سے تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہوگیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب، اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا، واں نقاب کا — مستی سے، ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا — کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

(۱۲۹)

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن، بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج! ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے، جس قدر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

(۱۳۰)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں، ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟ — سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم — وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں، غالبؔ، بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(۱۳۱)

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے، پر نہیں آتی

(۱۳۲)

جو نہ، نقدِ داغِ دل کی، کرے شعلہ پاسبانی تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی؟
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا کہ مرے عدو کو، یا رب! ملے میری زندگانی

(۱۳۳)

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل (ق) زنہار! اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی مطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں نے وہ سرور و سور، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

(۱۳۴)

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنّت، حیاتِ دہر کے بدلے نشّہ باندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھکو ہائے، کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
قتل کا میرے، کیا ہے عہد تو، بارے وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۱۳۵)

ہجومِ غم سے، یاں تک سرنگونی مجھکو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

(۱۳۶)

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

(۱۳۷)

جس بزم میں، تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سایہ کی طرح، ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو، اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

اُس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح، آئنہ گفتار میں آوے

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے، دلِ نالاں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

(۱۳۸)

حسنِ مہ گرچہ، بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خرشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے، تو مال اچھا ہے"

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے، جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ، یہ خیال اچھا ہے

(۱۳۹)

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی، نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

مے پرستاں! خم مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

(۱۴۰)

عجب نشاط سے جلاد کے، چلے ہیں ہم، آگے
کہ اپنے سایہ سے، سر پانو سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط خراب لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

خدا کے واسطے، داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم، آگے

(۱۴۱)

شکوہ کے نام سے، بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد، کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

(۱۴۲)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" — تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا — کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟
چپک رہا ہے، بدن پر لہو سے، پیراہن — ہمارے جیب کو، اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا — کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قایل — جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟
وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو، کیا ہے؟
پیوں شراب، اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

(۱۴۳)

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں! — چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے
قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو — کاش کے! تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں، غم گر اتنا تھا — دل بھی، یارب کئی دیے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر، غالبؔ — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

(۱۴۴)

خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں، تمھارے نام کے
عشق نے غالبؔ، نکمّا کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

(۱۴۵)

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے، سر تا سر روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی

(۱۴۶)

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، مے خانہ خالی ہے

(۱۴۷)

خلش غمزۂ خونریز نہ پوچھ دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا، روئیں گے یار؟ مگر آشفتہ بیانی میری
متقابل ہے، مقابل میرا رک گیا، دیکھ روانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی ہیچمدانی میری

(۱۴۸)

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز
جو داغ نظر آیا، اک چشم نمائی ہے

(۱۴۹)

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصوّر دل میں نظر آتی ہے، اک بوند لہو کی

(۱۵۰)

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے، بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

(۱۵۱)

ہر قدم، دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
صورتِ دود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے

بیکسیہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے، ہے
سایہ، خرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

(۱۵۲)

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے؟

میں بلاتا تو ہوں اس کو، مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے، لیے یوں ترے خط کو، کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو! وہ بھلے ہیں تو کیا؟
ہاتھ آویں، تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
پردہ چھوڑا ہے وہ، اس نے، کہ اٹھائے نہ بنے

(۱۵۳)

چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کی مانند، زخمِ دل گریبانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے، زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

(۱۵۴)

وہ آکے خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح، کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھاکے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے، ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

(۱۵۵)

تپش سے میری، وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بصحرا دادہ، نورالعین دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ، برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر، تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بو، بالش سے، اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو، خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ؟
کہ بیتابی سے، ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

(۱۵۶)

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما، غالبؔ
اگر گل، سرو کی قامت پہ، پیراہن نہ ہو جاوے

(۱۵۷)

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابندِ نے نہیں ہے
ہر چند، ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سے کوئی شے نہیں ہے
ہاں! کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند، کہیں کہ "ہے" نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے، زاہد؟ — مے ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالبؔ — آخر تو کیا ہے؟ "اے نہیں ہے"

(۱۵۸)

نہ پوچھ نسخۂ مرہم، جراحتِ دل کا — کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دلوں میں، تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ، کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

(۱۵۹)

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

(۱۶۰)

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ — یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے
مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی — وائے ناکامی! کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

(۱۶۱)

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے؟ — ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بِن نہ رہے — قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے؟
زہے کرشمہ! کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب — کہ بِن کہے ہی انھیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟
سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں وہ پرسشِ حال — کہ یہ کہے کہ "سرِ رہ گزر ہے"، کیا کہیے؟
انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟ — ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟

(۱۶۲)

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن، میری عریانی مجھے

کیوں نہ ہوے التفاتی؟ اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

(۱۶۳)

یاد ہے، شادی میں بھی ہنگامۂ "یارب" مجھے
سُبحۂ زاہد ہوا ہے، خندہ زیرِ لب مجھے

(۱۶۴)

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمایش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز، اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمایش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ "غافل تھے"
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمایش ہے

(۱۶۵)

کبھی، نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر، غالبؔ
وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۱۶۶)

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں، تو شانے میں الجھا دے مجھے

(۱۶۷)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا، مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا، مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش! یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا، مرے آگے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا، مرے آگے

(۱۶۸)

کہوں جو حال، تو کہتے ہو، "مدّعا کہیے"
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے؟

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا کہیے"

نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے، اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے، اس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں، حقیقتِ جانکاہیٔ مرض لکھیے
کہیں، مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیے

کبھی، شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی، حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان، تو خنجر کو "مرحبا" کہیے

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے
روانیٔ روشنی و مستیٔ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا، غالب
خدا سے، کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

(۱۶۹)

رونے سے، اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے، آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

(۱۷۰)

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں، برائے خندہ ہے
دعویٔ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

(۱۷۱)

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

افسردگی، نہیں طرب انشائے التفات
ہاں! درد بن کے، دل میں مگر جا کرے کوئی

چاک جگر سے، جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی — کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
ناکامیٔ نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے، عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی؟
بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی

(۱۷۲)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے، خدا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی؟

(۱۷۳)

تمھاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم، کیا ہے؟
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے

(۱۷۴)

باغ، پاکر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں، اب مر گئے پر، کون اٹھاتا ہے مجھے؟

(۱۷۵)

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، و لے — کیوں کر نہ کھائیے، کہ ہوا ہے بہار کی؟

(۱۷۶)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے، عمر بھر یوں دمبدم نکلے؟
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر، ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے، ظالم! تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے، کان پر رکھ کر قلم، نکلے
ہوئی، اس دور میں، منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں، نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ، غالبؔ، اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۱۷۷)

جز زخمِ تیغ ناز، نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

(۱۷۸)

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

۱۷۹

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو، کان میں رکھتا ہے انگلی، جادہ سے

(۱۸۰)

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

(۱۸۱)

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں، یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

(۱۸۲)

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں، ساغر متاعِ دست گرداں ہے
غم، آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

(۱۸۳)

دل مدعی و دیدہ بنا مدعیٰ علیہ — نظّارہ کا مقدمہ، پھر، روبکار ہے
پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے — وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

(۱۸۴)

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے؟ — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجسا کہیں جسے؟
غالبؔ، برا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے — ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

(۱۸۵)

شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی — جی، کسقدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے؟
اے پرتوِ خورشیدِ جہاںتاب، اِدھر بھی — سایہ کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

(۱۸۶)

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ، تیرے شہیدوں پہ، حور کی
واعظ، نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی
گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے، ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟
آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

(۱۸۷)

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام، بہت ہے — یہ رنج، کہ کم ہے مۓ گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟ — آلودہ بہ مے، جامۂ احرام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے؟ — شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

(۱۸۸)

مدّت ہوئی ہے، یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے، بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر، جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر، ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو، مقابل میں، آرزو
سرمے سے، تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے، پھر، نگاہ
چہرہ، فروغِ مے سے، گلستاں کیے ہوئے
پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
غالبؔ، ہمیں نہ چھیڑ، کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم، تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

(۱۸۹)

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست، جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی، آسماں کے لیے

بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

مثال یہ میری کوشش کی ہے، کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گدا سمجھ کے، وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم، میں نے، پاسباں کے لیے

ادائے خاص سے، غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے، یارانِ نکتہ داں کے لیے

قصائد

(۱)

سازِ یک ذرہ نہیں، فیضِ چمن سے، بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ، سویدائے بہار

سبز ہے جامِ زمرّد کی طرح، داغِ پلنگ
تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت، روئے شرار

کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

لعل سی، کی ہے، پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ، کہ جس کی، پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل، ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

(۲)

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں؟

بیدلیہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بیکسیہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں

ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے، آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سر و برگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں

ہاں، مہِ نو، سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے، کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے، دو دن کہاں رہا غایب؟
بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام

اڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا، دام

مرحبا! اے سرورِ خاصِ خواص
حبّذا! اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں، تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بہ گوش
غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو، تو ہو، اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھکو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام؟

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟
مجھکو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام؟

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟

جب کہ چودہ منازلِ فلکی ق
کر چکے قطع، تیری تیزیِ گام

تیرے پرتوے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں، لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا　　توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام　　تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟
مے ہی، پھر، کیوں نہ میں پیے جاؤں　　غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام؟
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے　　کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام
چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصّہ آئے　　کیوں رکھوں، ورنہ، غالبؔ اپنا نام؟

کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تو کہہ　　اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے؟ جس کے در پہ ناصیہ سا　　ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا، تو مجھ سے سن　　نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف　　نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز　　جس کا ہر قول، معنئ الہام
بزم میں، میزبانِ قیصر و جم　　رزم میں، اوستادِ رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا　　اے ترا عہد فرخی فرجام
چشم بد دور! خسروانہ شکوہ　　لوحش اللہ! عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے، قیصرِ روم　　جرعہ خواروں میں تیرے، مرشدِ جام
مرحبا! موشگافئ ناوک　ق　آفریں، آبدارئ صمصام
تیر کو تیرے، تیرِ غیر ہدف　　تیغ کو تیری، تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند؟　ق　برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا　　تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فنِ صورت گری میں تیرا گرز   ق   گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے   کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے   صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں، بہ کلکِ قضا   مجملاً مندرج ہوئے، احکام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی   دی، بدستور، صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے، بموجبِ حکم   اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روانیِ آغاز   ہو ابد تک رسائیِ انجام

(۴)

صبحدم، دروازۂ خاور کھلا   مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں   شب کو تھا، گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود   صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکا، یہ بازیگر، کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو   موتیوں کا، ہر طرف، زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر   اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِّ سحر   بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے، صبوحی کے لیے   رکھ دیا ہے، ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ   کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زریں، مہرِ تاباں سے سوا   خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے   رازِ ہستی، اس پہ سر تا سر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں   مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے   عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے　　منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے، لیکن ہر ایک　　میری حدِّ وسع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید　　کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیوں کر کھلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار　　مجھ سے، گر شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس　　لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا؟　　کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے　　یار کا دروازہ پاویں گر کھلا؟
مفت کا، کس کو برا ہے، بدرقہ　　رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے، بارانِ اشک　　آگ بھڑکی، مینہ اگر دم بھر کھلا
نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ　　رہ گیا خط، میری چھاتی پر، کھلا
دیکھیو، غالبؔ سے گر الجھا کوئی　　ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال　　پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامہ سے پائی طبیعت نے مدد　　بادباں بھی، اٹھتے ہی لنگر، کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ　　یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا　　بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب　　اب علوِّ پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس　　اب عیارِ آبروئے زر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے　　اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل　　تم پہ، اے خاقانِ نام آور کھلا
تم کرو صاحبقرانی، جب تلک　　ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

مثنوی در صفتِ انبہ

ہاں، دلِ دردمند، زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے "کیا لکھیے؟" — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے؟ — ثمر و شاخ، گوی و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟ — آئے، یہ گوی اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے، تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا، انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے؟ — آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار — جب خزاں آئے، تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں؟ — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہکن، باوجود غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام — شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے — باغبانوں نے باغِ جنّت سے
انگبیں کے، بحکمِ ربّ النّاس — بھر کے بھیجے ہیں، سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل — ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس؟
آم کو دیکھتا، اگر اک بار — پھینک دیتا طلائی دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا — نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ — طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے، آم — ناز پروردۂ بہار ہے، آم
خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو — نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیٔ ولایتِ عہد — عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں، عزِّ شان و جاہ جلال — زینتِ طینت و جمالِ کمال
کار فرمائے دین و دولت و بخت — چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے — خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور — جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت، اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت، اکلیل
ترا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے، عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے، دنیا میں بچھا مایدۂ بذلِ خلیل
بسخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم، داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا، ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا، حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش، مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھکو اماں
چرخِ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھکو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِرشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل، نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم، نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
درِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی
غم گیتی سے مرا سینہ "امر" کی زنبیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۲)

گئے وہ دن، کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی ؟ جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے ، گر یہ بھی کہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے ؟"

(۳)

نہ پوچھ اس کی حقیقت ، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں ، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

(۴)

قسمت بری سہی ، پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ ، کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں ، غالب ، خدا گواہ
کہتا ہوں سچ ، کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

(۵)

افطارِ صوم کی کچھ ، اگر ، دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے ، روزہ رکھا کرے
جس پاس ، روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے ، تو ناچار کیا کرے

گرچہ ازروئے ننگ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں، لیکن، اپنے جی میں، کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا، صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخّص چار
میری تنخواہ جو مقرّر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے، مردہ کی چھماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھکو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں، تہائی کا
ہو گیا ہے شریک، ساہوکار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجکو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۷)

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ، مجھے
کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے

رُباعیات

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں ؟ کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُرنم تھا

(۲)

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لیے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

(۳)

بھیجی ہے جو مجکو شاہ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

(۴)

کہتے ہیں کہ "اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں"
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

(۵)

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں "کہیں خدا سے" اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے